بدلتے پیمانے
مصنف
ڈاکٹر یوگیندر ناتھ شکل
مترجم
ڈاکٹر حدیث انصاری

مصنف

ڈاکٹر یوگیندر ناتھ شکل

مترجم

ڈاکٹر حدیث انصاری

4-1-L، اسٹاف کالونی، یونیورسٹی کیمپس

موہن لال سکھاڑیا یونیورسٹی اودے پور (راجستھان)

نام کتاب	:	بدلتے پیمانے
مصنف	:	ڈاکٹر یوگیندر ناتھ شکل
مترجم	:	ڈاکٹر حدیث انصاری
اشاعت	:	2014
تعداد	:	پانچ سو
کمپوزنگ	:	افروز کمپیوٹر (صدیق اختر) حسن مکھا ثانی مئو
ناشر	:	مترجم
قیمت	:	350.00

ISBN: 978-93-83313-21-1

البلاغ پبلی کیشنز، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

انتساب

پروفیسر عزیز اندوری
کے نام

چراغِ زندگی ہے، یا بساطِ آتشِ رفتہ
جلا کر روشنی دہلیزِ جاں پر سوچتے رہنا

پروفیسر آفاق احمد، پروفیسر خلیل احمد صدیقی، پروفیسر عبدالرحیم ندوی
عبدالعزیز (اکاؤنٹینٹ) اور پروفیسر محمد حلیم خاں
کی نذر

فہرست

پیش لفظ

رات، دن کے لمحوں کے تانے بانے اور حادثات سے زندگی، وقت، سال اور صدیوں کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس کا مرکزی کردار انسان ہے۔ زندگی کے پیچیدہ مسائل اور حادثات اس کے پلاٹ ہیں۔ صفحۂ زمین اس کا اسٹیج اور پردۂ سیمیں (Display Screen) ہے اور ابتدائے آفرینش سے ہی اس عمل کالائیو ٹیلیکاسٹ ہو رہا ہے۔

زمین پر جب انسان نے پہلا قدم رکھا، اسی وقت سے زندگی کے مسائل، حالات اور وقت کے دعوتِ مبارزت (Challenges) کو قبول کیا اور زمانے کو مقابلے کی دعوت بھی دیا۔ گردشِ وقت کے مقابلہ جاتی شاہراہ پر ہی چل کر آج کے ثریا سواد ترقی کی منزلوں کو حاصل کیا ہے۔ تلاش و جستجو اور عمل پیہم کی برق رفتاری میں کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ تجربات، مشاہدات، یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم کے نسخے سے اختراعات، ایجادات، انکشافات کو زندگی کا حصہ بنایا اور کائنات کو دستی آئینے (Hand Mirror) میں تبدیل کر دیا ہے۔

انسان نے زمین پر مشیت الٰہی سے جو پہلا حیرت انگیز اختراع کیا وہ بامعنی آواز ہے۔ آواز کو حرف میں، حرف کو لفظ میں، لفظ کو جملے میں بدل کر علوم وفنون، سائنس و ٹکنالوجی کے نئے نئے دروازے کھول دیئے۔ زبانوں کی کثرت میں وحدت اور ترقی بھی اس کا غیر معمولی کارنامہ ہے۔ آج دنیا کا کوئی بھی علم، سائنس، ٹکنالوجی، زبان کے بغیر اس

کا وجود صفر ہے۔

لمحوں اور صدیوں کے سائے میں زندگی، فکر، سماج معاشرہ، سیاست، اخلاق، کردار اور قول وفعل میں ہمیشہ تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ ان کا استقرار کبھی ایک نقطے پر نہیں رہا۔ ان کی پسند اور ناپسند کے معیار ومیزان اور پیمانے بدلتے رہے ہیں۔ ان تبدیلیوں کی آئینہ داری اور ترجمانی زبان کی مختلف اصناف میں کیا جاتا رہا ہے۔ ان اصناف کے آئینے میں وقت، فرد، جماعت، فکر، سماج اور سیاست کی تبدیلیوں کو بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔

عصر حاضر میں فکر، سماج، سیاست اور اخلاق کی حدیں اپنے دائرہ سے نکل کر فضائے بسیط میں کھلی پرواز کررہے ہیں جن قدروں اور اصولوں کو فرد، جماعت، قوم اور سماج کی صحت مندی اور ترقی کا پیش خیمہ مانا جاتا تھا آج انھیں جنسِ کارِ رفتہ کہہ کر ٹھکرادیا گیا ہے۔ تعصب، تنگ نظری، عریانی، زنا، فریب، مکاری، ظلم وزیادتی اس دور کے ترقی یافتہ سماج کا طرۂ امتیاز بن گیا ہے۔ ماضی میں بھی کم وبیش اسی قسم کے حالات تھے جس نے اہلِ فکر ودانش اور حساس ذہنوں کو غور وفکر کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ آج بھی چنداں تبدیلیوں کے ساتھ کچھ اسی قسم کے حالات ہیں جس میں اہل فکر ودانش اور حساس صالح اذہان گھٹن محسوس کررہے ہیں۔ انھیں حساس مفکروں اور ادیبوں نے کل تعمیری تخلیقی ادب اور ترجمے کے ذریعے آواز اٹھائی تھی اور اب یہ ذمے داری موجودہ حساس ادیبوں اور مترجمین کی ہے۔

تاریخ شاہد ہے تخلیقی ادب اور اس کے ترجمے سے ہر عہد میں ذہن سازی کا کام لیا گیا ہے۔ علم وادب اور دانش وحکمت کو فروغ انھیں راستوں پر چل کر ہوا ہے۔ تعمیری ادب اور اس کے تراجم ہماری تہذیب وترقی کی اساس ہیں۔ ترجمے کے عمل سے ایک زبان دوسری زبان سے، ایک ادب دوسرے ادب سے، ایک قوم دوسری قوم کے فکر وشعور اور علم وہنر سے آشنا ہوتی ہے۔ عصر حاضر کی شب وروز کی زندگی میں اسے ہر فرد محسوس کررہا ہے۔ مترجم ابلاغ وترسیل کا ایک موثر ذریعہ ہوتا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت اس کے سامنے

مسائل کے انبار ہوتے ہیں لیکن اس کی حقیقی ریاضت اور بصیرت ترجمے کو ممکن حد تک تخلیق کار کی فکری روح تک رسائی حاصل کر کے اس کی فکر کو عام کرنے میں معاونت کرتی ہے۔ اگر ابتدا سے ہی ترجمے کا یہ عمل جاری نہیں ہوتا تو شاید اقوام عالم ایک دوسرے کے فکر و شعور علم و ادب، انکشافات اور تجربات سے اتنے قریب نہیں ہوتے۔

ڈاکٹر یوگیندر ناتھ شکل ہندی کے پروفیسر اور کہنہ مشق مختصر کہانی کار ہیں۔ اندور کی سرزمین ان کے تدریس و تحریر کی عملی جولان گاہ ہے اور اندور میں راقم بھی ایک لمبے عرصے تک تدریسی و تخلیقی سرگرمیوں سے منسلک رہا ہے۔ اکثر ہم دونوں کی ملاقات دیوی اہلیہ یونیورسٹی کے مختلف امور کو انجام دینے کے دوران ہوتی تھی۔ کام سے فارغ ہونے کے بعد تبادلۂ خیال کا لمبا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ یہ ملاقات صرف گفتگو تک محدود نہیں ہوتی تھی بلکہ ادبی محفلوں کے علاوہ بھی فرصت میں یا تحریری کام کرتے وقت، سماج و سیاست، وقت اور حالات کے نشیب و فراز، زندگی کی کشمکش اور اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر تبادلۂ خیال ہوتا۔ اگلے دن ان میں سے اہم موضوع کو تحریر کا جامہ پہنانے کے بعد وہ سناتے اور پھر اسے کسی رسالے میں اشاعت کے لئے بھیج دیتے اور یہ بھی اصرار کرتے کہ یہ مشترکہ اثاثہ ہے۔ اسے اردو کے قالب میں ڈھالنے کی ذمہ داری آپ کی ہے۔ اور میں انشاء اللہ کہہ کر وعدہ کر لیتا۔

وقت ماہ و سال میں بدلتے رہے اور وعدے کی رسی بھی مرورِ ایام کے ساتھ بڑھتی رہی۔ انھیں درمیانی ایام میں میرا تقرر موہن لال سکھاڑیا یونیورسٹی، اودے پور کے شعبۂ اردو میں ہو گیا اور فروری ۲۰۱۲ء میں ڈیوٹی جوائن کر لیا۔ اندور سے وداع کرتے وقت ایک بار پھر وعدہ کو یاد دلایا.........! خوشی و غم کی دھوپ چھاؤں کے سائے میں ہم دونوں کے درمیان چند لمحہ خاموشی رہی.........! خاموشی کو توڑتے ہوئے دونوں کی نگاہیں یکا یک کسی انجام مستقبل کی خوشی کے احساس میں دوچار ہوئیں اور قدم مسکراتے، دعائیں دیتے ہوئے

خیالوں کی بھیڑ میں کھو گئے....! ایک دوست کو وداع کرتے وقت، ایک دوست کا ایسا اصرار اور تقاضہ تھا جس کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے...!

''بدلتے پیمانے'' کی صورت میں یہ کتاب اسی احساس کا عملی نتیجہ ہے۔ مصنف کے فکر و خیال اور اسلوب کو اردو میں منتقل کرنے میں کس حد تک رسائی حاصل کر پایا ہوں؟ یہ فیصلہ کرنا قاری کی ذمہ داری ہے۔ انھیں امیدوں کے ساتھ یہ کتاب اردو قارئین کی نذر کرتا ہوں۔

۲۳/جون ۲۰۱۴ء

حدیث انصاری
ایسوسی ایٹ پروفیسر
موہن لال سکھاڈیا یونیورسٹی، اودے پور (راجستھان)

تقریظ

میں یوگیندر ناتھ شکل کو ہندی زبان کے ایک لگھو کتھا کار یعنی افسانچہ نگار کی حیثیت سے گزشتہ کئی برسوں سے جانتا ہوں۔ اس دوران میں دہلی میں ان کے افسانچوں کے دو مجموعوں کی رسم اجراء کے موقعوں پر نہ صرف یہ کہ میں موجود رہا تھا بلکہ ایک جلسے کی صدارت کے فرائض بھی انجام دے چکا ہوں۔

ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں افسانچہ نگاری کو عموماً بیسویں صدی کی زائیدہ و پروردہ نثری صنف تصور کیا جاتا ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اردو میں افسانچہ نگاری کے اولین نمونے حیدر بخش حیدری کی تصنیف 'گلدستۂ حیدری' میں ملتے ہیں جو انیسویں صدی کے اوائل برسوں میں ڈاکٹر جان بورتھوک گلکرائسٹ کی تحریک پر فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں قلم بند کیے گئے تھے۔ اس کے قلمی نسخے برٹش میوزیم لندن اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آکسفورڈ کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ گلدستۂ حیدری سے منتخب ایک سو اسی افسانوں کا ایک انتخاب ڈاکٹر عبادت بریلوی کئی سال پہلے شائع کرا چکے ہیں۔

اردو میں ایک باقاعدہ صنف نثر کی حیثیت سے افسانچہ نگاری نے بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں اس وقت مقبولیت حاصل کی جب تقسیم ہند کے نتیجے میں برپا ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کے موضوع پر 'سیاہ حاشیے' عنوان سے افسانچوں کا ایک مجموعہ

منظر عام پر آیا۔ اس کے مصنف سعادت حسن منٹو تھے۔ 'سیاہ حاشیے' سے متاثر ہو کر اردو اور ہندی کے کئی قلم کاروں نے افسانچہ نگاری کے فن میں اپنا کمال دکھایا۔

یوگیندر ناتھ شکل بنیادی طور پر ہندی زبان کے افسانہ نگار ہیں۔ وہ گزشتہ تیس برسوں سے اس میدان میں اپنی طبع رسا کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ ہندی رسائل و جرائد میں اب تک ان کے تین سو پچاس سے زیادہ افسانچے شائع ہو چکے ہیں جن کی بنیاد پر انھیں 'لگھو کتھا شلپی' کا اعزاز مل چکا ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ یوگیندر ناتھ شکل کے افسانچوں کا ایک مجموعہ اردو زبان میں بھی شائع ہونے جا رہا ہے۔ اس کا عنوان 'بدلتے پیمانے' رکھا گیا ہے۔ ان افسانچوں کا انتخاب ڈاکٹر حدیث انصاری نے کیا ہے جو یوگیندر ناتھ شکل کے قریبی دوست اور مداح بھی ہیں۔ آج کل اودے پور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ ان تمام افسانچوں کے مترجم اور مرتب بھی ڈاکٹر حدیث انصاری ہی ہیں۔ انھوں نے بے حد خلوص اور سلیقے کے سے اس کام کو انجام دیا ہے اور اپنی صلاحیتوں کا ثبوت پیش کیا ہے۔

یوگیندر ناتھ شکل کے افسانچوں کی پہلی خصوصیت ان کا غیر رسمی اسلوب و انداز ہے انھوں نے ہماری روزمرہ کی زندگی میں مشاہدہ کیے جانے والے واقعات اور ان کے پس پشت کارفرما جذبات کو عام فہم زبان میں فنکاری کے ساتھ پیش کر کے اپنے عہد کی زندگی کا آئینہ بنا دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ مثال کے طور پر زیر نظر کتاب سے ماخوذ ان کے یہ افسانے ملاحظہ فرمائیں:

"کیوں بھائی صاحب! لڈو کیا بھاؤ دو گے؟ پچاس کلو چاہئے۔

ماسٹر صاحب! پچاس روپے کلو بیچ رہا ہوں، پر آپ کے لیے پینتالیس روپے کلو لگا دوں گا۔

''ارے بھائی، یوم جمہوریہ پر بچوں میں تقسیم کرنے ہیں۔قومی تہوار ہے، حساب سے دام لگاؤ''۔

آپ نے قومی تہوار کی بات کہی ہے اس لیے پینتیس کا بھاؤ لگادوں گا پر اس سے کم نہیں۔''

ٹھیک ہے...... یہ تین سو روپے پیشگی رکھ لو مگر بل پچاس کے حساب سے بنا دینا۔''

''جی میں سمجھ گیا۔لڈو اور بل آپ کو مقررہ وقت پر مل جائیں گے۔''

سات سو پچاس روپے کم نہیں۔'' ماسٹر صاحب یہ سوچتے ہوئے خوش خوش گھر لوٹ رہے تھے۔ (فریب)

''بھائی جی! ہمارے آپ کے تعلقات برسوں سے بنے ہوئے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ کا سیاسی قد بڑھے تاکہ پورے گروپ کو اس کا فائدہ مل سکے۔''

رضا کار کی بات سن کر وہ بولے ___ ''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''بھائی جی' اس بار ہمارا راون دوسروں کے راون سے بڑا ہونا چاہئے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ آج کی سیاست میں اپنی طاقت دکھائے بغیر کوئی بلندی حاصل نہیں کرسکتا۔'' ___ دوسرے رضا کار نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔

کچھ سوچنے کے بعد وہ بولے:''رضا کاروں کے بغیر نیتا کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔اگر آپ سبھی کی ایسی خواہش ہے تو اس بار ہم پچھلی بار کی طرح غلطی نہیں کریں گے کہ جس نے جو دیا ہم نے لے لیا...... اس بار ہم جو کہیں گے انھیں دینا پڑے گا...... آپ سبھی اپنے کام کے افسروں اور تاجروں کی فہرست بنانا

شروع کردیں۔"

__ ان کی بات سن کر رضا کاروں کے چہرے کھل اٹھے۔

اس بار دسہرے پر بھائی جی کا راون چرچا کا موضوع رہا۔ ان کے رضا کار لوگوں سے کہہ رہے تھے __ "بھائی جی نے اپنے راون کے قد کو اونچا کر کے پارٹی کو بتا دیا کہ علاقے میں ان کا دوسرے نیتاؤں سے زیادہ دبدبہ ہے۔ اس لیے اس بار چناؤ میں ان کا ٹکٹ کاٹا نہیں جا سکتا۔" (قد)

یوگیندر ناتھ شکل کے افسانچوں کے کردار عموماً عام لوگ ہی ہوتے ہیں جن میں اعلیٰ ادنیٰ، امیر غریب، ٹیچر، کلرک، دکاندار، افسر، نیتا، سپاہی، ڈرائیور اور مزدور مرد و عورت مختلف مقامات پر مختلف حالات کے دائروں میں نت نئے مسائل سے دوچار نظر آتے ہیں۔ مثلاً 'تحفے' کا باس اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لیے اسے پی ایچ ڈی کی ڈگری دینا چاہتا ہے۔ اس کا اسسٹنٹ باس کو خوش کرنے کی خاطر اپنے ایک لکچرر دوست سے یہ کام کرانے کے لیے بات کرتا ہے۔ دوست اسے خوش کرنے کے لیے اپنے شاگردوں اور ممتحن کے تعاون سے معقول معاوضے پر یہ کام کرا دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ لکچرر کے شاگرد اور ممتحن اسے خوش کرنے کے لیے ہی تو یہ کام انجام دیں اور ہر جگہ خوشی کے پس پشت مالی منفعت ہی کارفرما ہوگی۔ اس پندرہ سطروں پر مشتمل اس افسانچے پر اگر ہم غور کریں تو ہمارے سماج اور تعلیمی اداروں میں پھیلی ہوئی بدعنوانی کی کئی پرتیں کھلتی چلی جائیں گی۔

ایک اور افسانچہ بعنوان 'حسد' کے موہن بابو اور شرما صاحب بھی اسی سماج کے دو کردار ہیں جو برسوں تک ملازمت میں رہنے کے بعد تقریباً ایک ساتھ ریٹائر ہوئے۔ ایک عرصے بعد جب دونوں کی ملاقات ہوتی ہے تو وہ ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرتے ہیں۔ موہن بابو دردناک لہجے میں اپنی بپتا سناتے ہوئے کہتے ہیں کہ تمام مادی آسائشیں میسر ہونے کے باوجود وہ اپنے گھر میں اجنبی کی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ

سن کر شرما جی افسوس ناک لہجے میں بتاتے ہیں کہ خود ان کی حالت بھی گھر میں رکھی ہوئی لغت کی طرح ہے کہ وقت ضرورت اسے کھول کر استفادہ کرلیا جاتا ہے ورنہ ایک کونے میں پڑی رہتی ہے۔ اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔

یہ افسانچہ خود اپنے گھر میں اپنے ہی خاندان کے افراد کے درمیان کسمپرسی کی زندگی گزارنے والے دو بزرگ کرداروں کے مکالموں کے ذریعے ہمارے سماج کی ایک ایسی حقیقی صورتِ حال کو پیش کرتا ہے جسے دیکھنے، جس پر سوچنے اور جس کا حل تلاش کرنے کی طرف کوئی توجہ دینے کو تیار نہیں۔ اس افسانچے کا عبرت ناک پہلو یہ ہے کہ موہن بابو اپنے دوست شرما جی کی مبینہ حیثیت کو اپنے سے بہتر تصور کر کے جذبۂ حسد میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

___ یوگیندر ناتھ شکل کی اسی کتاب سے ایک اور افسانچہ ملاحظہ فرمائیں:

''ماسٹر جی بچوں کو کھانا دیتے ہوئے کہہ رہے تھے:

میں چاہ کر بھی تم لوگوں کے لیے وہ سب نہیں کر پاتا جو ایک معلم کو کرنا چاہیے...... پانچ کلومیٹر دور سائیکل سے آنا پڑتا ہے...... نہ یہاں بس آتی ہے نہ ٹیمپو...... اسی وجہ سے یہاں کوئی آنا نہیں چاہتا...... تم تو جانتے ہو جب سیوارام چھٹی پر رہتا ہے تو مجھے ہی گھنٹی بجانی پڑتی ہے...... کھانے کی کوالٹی درست کرنے کی میں نے بہت کوشش کی، لیکن ناکام رہا۔ جو رقم حکومت سے ملتی ہے، وہ میرے پاس آتے آتے آدھی ہو جاتی ہے۔''

___ ماسٹر جی کو مغموم ہوتا دیکھ کر ایک طالب علم انھیں تسلی دینے لگا۔ 'ماسٹر جی آپ افسوس نہ کریں...... ہم سب آپ کی مجبوری سمجھتے ہیں۔ میرے بابو کہہ رہے تھے کہ یہ لوگ شیطان ہیں...... جو روپیہ سرکار ہمارے لیے دیتی ہے۔ یہ اسے کھا جاتے ہیں۔'

''میری ادھوری بات کو اس نے پورا کر دیا'' کہتے ہوئے ماسٹر جی نے اس

کے سر پر ہاتھ پھیرا اور آگے بڑھ گئے۔ (شیطان)

یوگیندر ناتھ شکل کے افسانچوں میں ہمارے ارد گرد کے کرداروں، ان کے مکالموں اور انھیں پیش آنے والے واقعات اور درپیش مسائل کے ذریعے عہد حاضر کی زندگی کی ایسی تصویریں ملتی ہیں جو ہماری دیکھی بھالی تو ہیں لیکن انھیں رک کر دیکھنے اور ان پر کچھ سوچنے کی زحمت کوئی نہیں کرتا۔ یہ تصویریں جن مخصوص زاویوں سے پیش کی گئی ہیں وہ مصنف کا اپنا زاویۂ فکر و نظر ہے۔ 'بے بسی' میں سچ بولنے کی مشکلات ہیں۔ دانش مندی میں ایماندار افسر کے بے ایمان بننے کی وجوہات ہیں۔ 'جیب کترے' میں محکمۂ پولس کی اصلیت ہے تو 'آدمی' میں انسان اور حیوان کا درمیانی فرق مٹا دینے والا جذبۂ خود غرضی نمایاں ہوا ہے۔ 'تحفہ' میں تعلیمی اداروں میں در آنے والے کرپشن کی لعنت ہے۔ 'چراغ' میں بیٹی کی شادی کا مسئلہ، بیٹوں کی توتا چشمی اور باپ کی فکر مندی ہے اور 'ڈگری' میں اس حقیقت کا مؤثر اظہار کہ چپراسی سے لے کر آفیسر تک کے عہدوں کے لیے ڈگری لازمی ہوتی ہے لیکن نیتا بننے کے لیے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جاتی۔ 'بدلتے پیمانے' کے ان سب افسانچوں کے پس پشت خود یوگیندر ناتھ شکل بے ایمانوں اور ظالموں کے مقابل ایماندار اور مظلوم انسانوں کی حمایت میں کھڑے نظر آتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ اردو داں حلقوں میں 'بدلتے پیمانے' کا پرخلوص استقبال کیا جائے گا اور ڈاکٹر یوگیندر ناتھ شکل کے فن کو سراہتے ہوئے ان کی کتاب کے مترجم ڈاکٹر حدیث انصاری کی مخلصانہ کاوش کو بھی دھیان میں رکھا جائے گا۔

پروفیسر صادق
سابق صدر شعبۂ اردو
دہلی یونیورسٹی، دہلی

تصویر

وہ پلنگ پر بیٹھے جوابی امتحانی کاپیوں (Answer Books) کو چیک کر رہے تھے۔ایک جوابی کاپی کا جیسے ہی ایک صفحہ ان کے سامنے آیا، ان کے ہاتھ رک گئے۔

انھوں نے بیوی کو آواز لگائی ''سنو! میں اس لڑکے کو کتنے نمبر دوں، میں طے نہیں کر پا رہا ہوں .... ہندوستان کا نقشہ بنانے کو کہا گیا تھا اور دیکھو اس نے یہ کیا بنایا ہے؟''

بیوی جھک کر جوابی کاپی دیکھنے لگی۔ نقشے میں غریبی، دہشت گردی، فرقہ وارانہ فسادات، بدعنوانی اور بے روزگاری وغیرہ لکھ کر چاروں طرف سیاہ دھبے بنائے گئے تھے۔

بیوی نے نقشے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا، ''اس کا یہ جواب تو غلط ہے پر اس نے ملک کی سہی تصویر کھینچ دی ہے اس لئے اسے نمبر تو ملنے چاہئے''۔

''......... پر میں اسے صفر دینے کی سوچ رہا تھا!''

''آپ بھی اوروں کی طرح ہو گئے ہیں، جو سچائی سے منھ پھیر لیتے ہیں۔''

ماسٹر صاحب سوچ میں پڑ گئے۔

بیوی کمرے سے باہر جا چکی تھی، پر ملک کی ''تصویر'' میں جو کمی رہ گئی تھی، وہ اس کی گفتگو سے پوری ہو گئی تھی۔

آپ بیتی

ان کا شمار شہر کے اثر دار لوگوں میں ہوتا تھا۔ شہر کے متعدد یتیم خانے، ضعیف خانے اور گندی بستی کے اسکول ان کی مالی امداد سے چل رہے تھے۔

ایک دن ان کے رفیق خاص نے انھیں مشورہ دیا۔ ''آپ نے بیس پچیس سالوں میں تجارت اور سماج میں جو بلندیاں حاصل کی ہیں، وہ قابل تعریف ہیں۔ میری خواہش ہے کہ آپ بھی دوسرے بڑے آدمیوں کی طرح آپ بیتی لکھیں تا کہ آپ کی مثالی زندگی سے دوسرے بھی سبق لے سکیں۔

اسی لمحہ انھوں نے من ہی من آپ بیتی لکھنے کا فیصلہ کرلیا۔

بچپن میں اسکول کے درجات میں استاد کی پڑھائی گئی متعدد باتیں انھیں اب تک یاد تھیں۔ ان میں سے ایک بات ان کے دماغ میں اس وقت آجاتی جب وہ اپنے اسٹڈی روم میں آپ بیتی لکھنے بیٹھتے۔ آج بھی ایسا ہی ہوا۔ کرسی پر بیٹھ کر انھوں نے جیسے ہی دو تین سطریں لکھیں کہ سوچ میں ڈوب گئے .... آج محسوس ہو رہا ہے کہ اتنے کم وقت میں آدمی ایمانداری سے صرف اپنے پریوار کا گزر بسر کرسکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ ایک مکان بنا سکتا ہے .... اتنی بڑی جاگیر نہیں بنا سکتا۔ جھوٹ، فریب اور مکاری کا سہارا لے کر میں نے اتنی بلندی حاصل کی ہے! میری سماجی خدمت کے پیچھے بھی میری کالی کمائی ہے۔ اس سوچ کے ساتھ انھیں استاد کی وہ بات یاد آگئی .... خودنوشت انسان کی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے، اس میں جھوٹ نہیں لکھا جاتا۔ اس قول کے یاد آتے ہی وہ

پریشان ہو اٹھے۔

اُف! اپنے آپ سے پوری سچائی کے ساتھ روبرو ہونا کتنا مشکل ہوتا ہے!
پہلے یہی لگتا تھا کہ زندگی کتاب کے لائق ہے، پھر لگا کہ کچھ صفحات لائق ....اوراب
لگ رہاہے کہ زندگی کچھ پیراگراف تک ہی سمٹ کر رہ گئی۔

انھوں نے فوراً فیصلہ بدل دیا۔ 'بہتر ہوگا کہ جو مقام سماج میں بنا ہوا ہے، اسی پر
صبر کرلیا جائے!'

انھوں نے لکھے ہوئے کاغذوں کے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے۔
ان کی آپ بیتی ٹکڑوں کی شکل میں ''ڈسٹ بین'' میں پہنچ گئی۔

فن کار

جس نے بھی وہ منظر دیکھا، واہ واہ پکار اٹھا۔

راون کی شبیہ بہت ڈراؤنی اور خوفناک تھی۔ اس کی بڑی بڑی پلکیں اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔ رام، لکشمن اور ہنومان کی تصویر میں دلکشی تھی۔ چاروں طرف سنہرے کپڑے کی لنکا بنائی گئی تھی۔

آہستہ آہستہ میدان سامعین و ناظرین سے بھرتا جا رہا تھا۔ نیتا جی اسٹیج سے عوام کو خطاب کر رہے تھے۔ وقفے، وقفے سے راکیٹ چھوڑے جا رہے تھے۔ سبھی خوش تھے۔ لیکن اس بھیڑ میں دو شخص ایسے بھی تھے جن کے چہرے سے دکھ، درد کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔

''اختر میاں! اسے تو خدا کا ذرا بھی خوف نہیں.........!

ہمیں طے شدہ مزدوروں کی جگہ آدھی رقم پکڑا دی.........عوام کے چندے میں سے ہزاروں روپئے ہضم کر گیا۔ اور اب اسٹیج سے ایماندارانہ زندگی بسر کرنے کی نصیحت کر رہا ہے۔''

بھائی جان! میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ آرٹسٹ پر زیادتیاں کیوں ہو رہی ہیں۔ پہلے کے زمانے میں ان کے ہاتھ کٹوا دیئے جاتے تھے۔ انھیں جان سے مروا دیا جاتا تھا اور اب نیتا گیری کا دھونس دے کر محنت اور مزدوری کا پیسہ ہضم کیا جا رہا ہے۔''

دونوں بوجھل قدموں سے میدان سے باہر نکلنے لگے۔

چراغ

لمحے بھر کے لئے وہ بات اس کے دماغ سے ہٹتی، کہ دوسرے ہی لمحہ دوبارہ بجلی کی طرح چمک جاتی اور وہ پریشان اٹھتے!

انھوں نے چشمہ لگایا۔ دیوار پر آویزاں گھڑی کی طرف نظریں دوڑائیں۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ دور کہیں سے ابھی بھی پٹاخے چھوٹنے کی آوازیں رک رک کر آرہی تھیں۔

اپنا دھیان بٹانے کے لئے وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔ تیز ہوا چلنے کے سبب بھی چراغ بجھ گئے تھے۔ صرف دو چراغ ابھی بھی جل رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر اچانک ہردیال کی وہ بات یاد آگئی۔ 'انکل! آپ نے کہا تھا۔ اس لئے میں اس بار ممبئی میں اس سے مل کر آیا۔...... پچھلے چھ ماہ سے وہ دفتر میں اپنے ساتھ کام کرنے والی خاتون کے ساتھ اس فلیٹ میں رہ رہا تھا.......... کہتا تھا کہ فلیٹ کرائے پر لیا ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ اس نے اسے خرید لیا ہے۔.......... جب میں نے اس سے پوچھا کہ کیا شادی کر لی ہے؟ تو وہ بولا، ہم دونوں نے ابھی اس موضوع پر کوئی فیصلہ نہیں لیا ہے! میں نے اس سے جب گیتا بہن کی شادی کے سلسلے میں ذکر کیا تو اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ ممبئی والوں کی طرح وہ اب صرف اپنے ہی بارے میں سوچتا ہے۔ گھر والوں کی اسے ذرا بھی فکر نہیں!

پہلے بڑا بیٹا گھر سے الگ ہوا اور اب یہ بھی ......! میں نے گیتا کی شادی میں اس سے جو امید لگائی تھی، آج اس نے بھی دم توڑ دیا۔

'ارے! چراغ کہیں بجھ نہ جائیں ......!' رک رک کر جل رہے ان دونوں چراغوں کو دیکھ کر وہ اپنے آپ سے مخاطب ہوئے اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ ایک چراغ بجھ گیا تھا۔ انھوں نے فوراً دوسرے کی بتّی ٹھیک کی، وہ بجھتے بجھتے پھر جل اٹھا۔

......بھلے ہی ان دونوں نے بھائی اور بیٹے کا فرض پورا نہیں کیا مگر میں باپ ہوں ....میں اپنا فرض نبھاؤں گا............ جیسے بھی ہوگا، میں گیتا کی شادی کروں گا۔ ایک چراغ کافی ہے، گھر کی روشنی کے لئے! وہ مسلسل اس چراغ کو دیکھے جا رہے تھے۔ خود اعتمادی سے ان کا چہرہ چمک اٹھا۔

جنون

دوپہر کو اچانک فساد بھڑک اٹھا۔ جب حالات قابو میں نہیں آئے تو کرفیو کا اعلان کر دیا گیا۔

رات کو سنسان سڑک پر روڈویز کی ایک بس بہت تیز رفتار سے چلی جا رہی تھی۔ ڈرائیور بس اسٹینڈ پر سواریاں اتار کر بس کو ڈپو میں لے جا رہا تھا۔

سڑک کے بیچ و بیچ بڑے بڑے پتھر رکھے ہونے کے سبب اسے گاڑی روک دینا پڑا۔

نوجوانوں کی ایک ٹولی نے گاڑی کو گھیر لیا۔ سبھی کے ہاتھ میں تلوار، لاٹھی اور چھرے تھے۔

''دیکھو! کون ہے......!''

''اتارو سالے کو نیچے..........بس میں آگ لگا دو!''

استاد کی آواز سنتے ہی ان لوگوں نے ڈرائیور کو نیچے اتارا۔

'مارو مارو' کی آواز گونج اٹھی۔ ڈرائیور نے بھاگنے کی کوشش کی، تبھی ایک تلوار اس کی پیٹھ کے آر پار ہوگئی، خون کا فوارہ نکل پڑا۔ ڈرائیور چیخ کر وہیں گر پڑا۔ بس دھوں دھوں کر جلنے لگی۔ نوجوانوں کی ٹولی بھاگ گئی۔

دوسرے دن وہ ٹولی شہر کے باہر سنسان جگہ پر اکٹھا تھی۔ ان کے چہرے پر اڑتی ہوئی ہوائیاں ان کی انسانیت پر سوالیہ نشان لگا رہی تھی۔

وہ ایک دوسرے کو اخبار پڑھ کر سنا رہے تھے۔ کل فسادیوں کے ہاتھ مارا جانے والا ڈرائیور رام لال تھا۔ الٰہی بخش کے نہ آنے پر اتفاقیہ، فوری طور سے رام لال کی ڈیوٹی لگائی گئی تھی۔

تحفے

"پرشانت بھائی! آپ تو متعدد طالب علموں کو ڈاکٹر بنا چکے ہو.......... یار، میرے باس اپنی بیگم کو پی ایچ.ڈی. کرانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کی ان پر مہربانی ہوگئی تو اس بہانے میرا بھی سکہ جم جائے گا!"

"پرکاش جی! آپ حکمراں آفیسر ہیں اور میں لیکچرار........... ہم لوگوں کو آپ کی طرح نوکر چاکر، گاڑی بنگلہ نہیں ملتا، نہ ہی دیگر سہولیات.......... ! اس لئے اس میں لگا رہتا ہوں.......... تین چار طالب علم ہر وقت ہماری خدمت میں لگے رہتے ہیں!"

'یار! باتیں صاف صاف ہو جائیں تو تعلق ہمیشہ قائم رہتا ہے.......... اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ کتنا خرچ لگے گا؟"

"پرکاش جی! میں آپ کی صاف گوئی کا قائل ہوں.......... آپ میرے دوست ہیں، اس لئے چالیس ہزار لگیں گے.......... ہاں، باہر سے جو ممتحن آئیں گے، انھیں ہوٹل میں رکوانے، ان کے کھانے پینے اور تحفے کا خرچ الگ..........!"

"خرچ کی آپ فکر نہ کریں.......... باس کی پچاس ہزار روپئے ماہ کی دیگر آمدنی ہے! آپ تو یوں سمجھ لیں کہ وہ اپنی بیگم کو پی ایچ.ڈی. کی ڈگری "تحفے" میں دینا چاہتے ہیں!"۔

"آپ کبھی بھی باس کو گھر لے آیئے۔ آپ کا حکم ہے، اس لئے یہ کام تو کرنا ہی پڑے گا۔"

حسد

موہن بابو اور شرما صاحب تقریباً ایک ساتھ ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے۔
آج موہن بابو شرما صاحب سے ملنے آئے تھے۔

''موہن بابو! گھر میں سب ٹھیک چل رہا ہے......!
آپ کے بیٹے بہو، آپ کا خیال رکھتے ہیں یا نہیں......؟''
بسکٹ کی پلیٹ ان کے سامنے رکھتے ہوئے شرما صاحب بولے۔

آپ سے کیا چھپانا............سبھی کچھ اپنا ہوتے ہوئے بھی گھر میں اجنبی کی طرح ہوں۔'' موہن بابو نے درد بھری آواز میں جواب دیا۔

''یہ تو میری کہانی ہے، آپ کی زندگی کیسے گزر رہی ہے؟'' اپنے آئینہ اور کتابی صفت چہرے سے غم کی زردی کو دور کرتے ہوئے انھوں نے شرما جی سے پوچھا!

''آپ تو جانتے ہیں، دونوں بیٹے میرے ملازمت سے سبکدوش ہونے سے پہلے ہی گھر سے الگ ہو گئے تھے۔ اب ہماری حالت گوشے میں رکھی ہوئی اس لغت کی طرح ہے..........جب ضرورت ہوتی ہے اسے کھولا جاتا ہے ورنہ کونے میں پڑی رہتی ہے''۔ شرما صاحب الماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

ان کی بات سن کر موہن بابو کا من بھاری ہو گیا..........
انھیں 'اجنبی' سے 'لغت' کی حالت کافی بہتر لگ رہی تھی۔

بھوت

کلکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے لاہوٹی جی ہر روز چہل قدمی اور تفریح کے لئے جایا کرتے تھے۔آج انھیں کچھ تاخیر ہوگئی۔اس لئے پبلک اسکول کا صحن بچوں سے بھرا دکھائی دے رہا تھا۔ بچے کوٹ، پینٹ، ٹائی پہنے قطار میں کھڑے ہوکر دعائیہ نظم گا رہے تھے۔یہی دعائیہ نظم بچپن میں وہ بھی گایا کرتے تھے۔وہ اسے سن کر جھوم اٹھے۔

جھاڑیوں کی کھڑ کھڑاہٹ سے ان کا دھیان ٹوٹا...... ان کے سامنے سر پر ہیٹ لگائے، ہاتھ میں چھڑی لئے ایک بدشکل غیر ملکی کھڑا تھا۔

''کتنے ظالم ہو تم .... بچے بوجھ سے دبے جا رہے ہیں اور تم خوش ہو رہے ہو! افسوس ہے تم پر......!'' وہ بوڑھا انھیں گھورتا ہوا انگریزی میں بولا۔

اس کی بات سن کر لاہوٹی جی غصے سے تمتما اٹھے۔''کون ہیں آپ......؟ فضول کی باتیں کئے جا رہے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے۔

وہ بوڑھا ان کے پیچھے چلتا ہوا بڑبڑانے لگا۔

''انگریزیت کے قیام کے لئے میں نے جو استعمال کیا تھا۔اسے تم لوگوں نے کامیاب کردیا۔تم ہندوستانی مبارک باد کے مستحق ہو.......... !تم نے مجھے غیرفانی کردیا!

میکالے غیرفانی ہوگیا........... ہا.......... ہا.......... ہا! لاہوٹی جی دانت پیستے ہوئے اسے مارنے کے لئے پیچھے مڑے۔

وہ حیرت میں تھے!.......... وہاں کوئی نہیں تھا۔صرف وہ الفاظ ہوا میں گونج رہے تھے۔

بارش

''سکھیا! آج بستی میں چاروں طرف خوشی چھائی ہوئی ہے............سب کتنے خوش ہیں!'' جھونپڑی میں داخل ہوتے ہوئے شوبھارام بولا۔

''مجھے بھی آج پچھلی دیوالی یاد آگئی............ساری بستی میں کتنی اداسی چھائی تھی ....اپنے یہاں نہ تو گھاس لیٹ تھا اور نہ تیل۔ ....باسی روٹیاں کھا کر ہم نے دیوالی منائی تھی۔'' سکھیا نے اسٹو کو تیل سے جلاتے ہوئے جواب دیا۔

''آج بچوں کے لئے کیا بنا رہی ہو؟''

''آج میں بچوں کو گرما گرم پوریاں بھر پیٹ کھلاؤں گی'' وہ خوش ہو کر بولی۔

شوبھارام تھوڑی دیر جھونپڑی میں رکا پھر باہر آکر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں پوریاں تلنے کی سوندھی خوشبو سے جھونپڑی مہک اٹھی۔ جیسے ہی وہ خوشبو اس کی ناک سے ٹکرائی، اس نے جھونپڑی کے اندر دیکھا۔ تینوں بچے کڑھائی کو گھیرے کھڑے تھے۔ اس پر تیرتی، پھولی ہوئی پوریوں کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

''بھگوان! ایسی بارش ہمیشہ کرواتے رہنا............'' آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے دعا کے ہاتھ اٹھائے اور لمبی لمبی سانسیں کھینچ کر اندر سے آتی ہوئی اس مہک کو اپنے اندر سمیٹنے لگا۔

فریب

''کیوں بھائی! لڈو کیا بھاؤ دو گے؟ پچاس کلو چاہئے''

''ماسٹر صاحب! پچاس روپئے کلو بیچ رہا ہوں، پر آپ کے لئے پینتالیس روپئے لگا دوں گا۔''

''ارے بھائی! ''یوم جمہوریہ'' پر بچوں میں تقسیم کرنے ہیں ....قومی تیوہار ہے۔حساب سے دام لگاؤ''!

''آپ نے قومی تیوہار کی بات کہی، اس لئے پینتیس کا بھاؤ لگا دوں گا .... پر اس سے کم نہیں''!

''ٹھیک ہے.......... یہ تین سو روپئے پیشگی رکھ لو، مگر بل پچاس کے حساب سے بنا دینا!''

''جی میں سمجھ گیا، لڈو اور بل آپ کو وقت مقررہ پر مل جائیں گے''۔

''سات سو پچاس روپئے کم نہیں!، ماسٹر صاحب یہ سوچتے ہوئے خوش خوش گھر لوٹ رہے تھے۔

میرا بھارت مہان

گھر پہنچتے ہوئے انل جی کی بیوی نے روتے ہوئے کہا کہ پولس ببلو کو تھانے لے گئی ہے۔ وہ گھبرائے ہوئے تھانے پہنچے۔ وہاں انھیں معلوم ہوا کہ جب ببلو کالج سے گھر لوٹ رہا تھا تو راستے میں کسی آدمی نے ایک لڑکے کو اسکوٹر سے ٹکر ماری اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ پولس والوں نے فوراً اسکوٹر ڈرائیور کو پکڑ لیا۔ ببلو کے سامنے حادثہ ہوا تھا۔ اس لئے اس کا نام اور پتہ نوٹ کر لیا گیا۔

انل جی نے تھانے دار سے بات کی، ''سر! میرے بیٹے کو اس حادثے سے دور رکھئے .... وہ پڑھائی کرے گا کہ تھانے اور کچہری کے چکر لگائے گا؟''

''دیکھئے جناب! حادثہ آپ کے بیٹے کے سامنے ہوا ہے .... اس کے بیان سے ہی تو کیس پختہ ہوگا۔''

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ اس کی جگہ میرا نام لکھ لیں .... اس کی پڑھائی پر اس سے فرق پڑ سکتا ہے''!

''باپ کی حکومت ہے کیا......؟ تھانے دار نے دہاڑتے ہوئے کہا۔ انل جی تھانے دار کے سامنے بہت منت وسماجت کئے لیکن اسے ذرا سا بھی اثر نہیں ہوا۔

بچے کی مرہم پٹی ہو گئی تھی۔ وہ ہسپتال سے گھر جا چکا تھا۔ اسکوٹر ڈرائیور کے لئے کسی نیتا کا فون آ گیا۔ اسے بھی چھوڑ دیا گیا تھا۔

انل جی فکر مند تھانے دار کے کمرے کے باہر بیٹھے تھے۔ قریب ہی ان کا لخت جگر سہما ہوا کھڑا تھا۔ کمرے کے اندر تھانے دار چند لوگوں کے ساتھ ناشتہ کر رہا تھا۔ جیسے ہی

وہ لوگ کمرے سے باہر نکلے، انل جی اندر داخل ہوئے۔ میز پر دوسو روپئے رکھ کر وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ روپئے جیب میں رکھ کر تھانے دار نے سپاہی کو آواز لگائی ''ارے اس چھوکرے کو جانے دینا...... اب اس کے بیان کی کوئی ضرورت نہیں......!''

باپ بیٹے تھانے سے باہر نکل آئے۔ انل جی کی نگاہیں تھانے کے صدر دروازے پر لگے بورڈ پر ٹک گئیں، اس پر بڑے بڑے الفاظ میں لکھا تھا'' میرا بھارت مہان!''

انھوں نے اس بورڈ کی طرف دیکھا اور نفرت و حقارت سے اپنا چہرہ دوسری جانب کرلیا۔

تناؤ

ان کی نگاہیں سڑک پر ٹکی تھیں لیکن دماغ ابھی دفتر میں تھا۔

یہ عوامی خدمت گار صرف نام کے ہیں ....نوکری رشوت دے کر حاصل کرتے ہیں، اس لئے رشوت لینے میں انھیں ذرا بھی ڈر نہیں لگتا......! ایسے آفیسر اگر پلّے پڑ جائیں تو بہت چوکنا رہنا پڑتا ہے .... یہ اپنی غلطی کو بہت چالاکی کے ساتھ دوسروں کے سر رکھ دیتے ہیں .... آج اسٹاف کلب میں لوگ باتیں کر رہے تھے کہ آنے والے صاحب جانے والے سے بھی کمتر ہیں .... کل نئے صاحب اپنا کام سنبھالیں گے اور پرانے کو وداع کیا جائے گا۔ اس موقع پر مجھے خطاب کرنے کے لئے کہا جائے گا۔ ...... مجھے ان کی جھوٹی تعریف کرنی پڑے گی اور میرا ضمیر میری ملامت کرے گا۔

گھر پہنچتے ہی انھوں نے بیوی کو پوری بات بتائی۔ انھوں نے سمجھایا۔ ''آپ اصول پسند آدمی ہیں .... ان کی جھوٹی تعریف کرتے وقت اگر کہیں آپ کی زبان پھسل گئی تو .... ! بہتر ہے کہ آپ کل کی رخصت لے لیں !''

بیوی سمجھ گئی تھی کہ وہ کس بات کو لے کر اتنے تناؤ میں ہیں !

قد

''بھائی جی! ہمارے آپ کے تعلقات سالوں سے بنے ہوئے ہیں...... ہماری خواہش ہے کہ آپ کا سیاسی قد بڑھے تا کہ پورے گروپ کو اس کا فائدہ مل سکے''۔

رضا کار کی بات سن کر وہ بولے'' یہ کیسے ممکن ہے؟''

''بھائی جی! اس بار ہمارا راون دوسروں کے راون سے بڑا ہونا چاہئے ...... آپ تو جانتے ہی ہیں کہ بغیر اپنی طاقت کو بتائے آج سیاست میں کوئی بلندی حاصل نہیں کر سکتا!'' دوسرے رضا کار نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔

''وہ کچھ دیر غور و فکر کرتے رہے، پھر بولے، رضا کار کے بغیر نیتا کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اگر آپ سبھی کی ایسی خواہش ہے، تو اس بار ہم پچھلی بار کی غلطی نہیں کریں گے کہ جس نے جو دیا ہم نے لے لیا........... اس بار ہم جو کہیں گے انھیں دینا پڑے گا............ آپ سبھی اپنے کام کے آفیسران اور تاجروں کی فہرست بنانا شروع کردیں۔''

ان کی بات سن کر رضا کاروں کے چہرے کھل اٹھے۔

اس بار دسہرے پر بھائی جی کا راون چرچا کا موضوع رہا۔ ان کے رضا کار لوگوں سے کہہ رہے تھے...... ''بھائی جی نے اپنے راون کے قد کو اونچا کر پارٹی کو بتا دیا کہ علاقے میں ان کا دوسرے رہنماؤں سے زیادہ دبدبہ ہے۔ اس لئے اس بار چناؤ میں ان کا ٹکٹ کاٹا نہیں جا سکتا!''

تعلیم یافتہ

''جب میں نے مذاکرہ میں شرکت نہ کرنے کا من بنا چکا تھا تب سر نے ہی میری حوصلہ افزائی کی تھی .... انھوں نے موضوع سے متعلق مواد مجھے تحریر کر کے دیا تھا۔ وہ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے .... تمھیں تو معلوم ہے کہ اسی وجہ سے میں یونیورسٹی میں ممتاز مقرر کا انعام جیت پایا تھا۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنے پرس سے وہ کاغذ نکالا جو پرانا ہونے کے سبب جگہ جگہ سے پھٹنے لگا تھا۔ اس نے اسے بہت سنبھال کر کھولا اور دوست کو دکھانے لگا۔

''مجھے بھی ان کی یاد آتی ہے .... پورے کالج میں ان کی طرح ایک بھی پروفیسر نہیں ہے .... کتنی محبت تھی ان کے من میں اپنے شاگردوں کے لئے ....!''

یہ کہتے ہوئے دوست کی آنکھیں بھر آئیں!

جن لڑکوں نے طلبا یونین کے انتخاب میں ان پر غیر قانونی کام کرنے کا غلط الزام لگا کر ان کے پیٹ میں چھورے مارے تھے وہ مجھے جب بھی دکھائی دیتے ہیں میرا خون کھولنے لگتا ہے!'' اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔

''سنا ہے ان بد کردار لڑکوں کو کسی بڑے نیتا کا تحفظ حاصل ہے۔ اسی ڈر سے حادثے کے وقت موجود اسٹاف کے لوگوں اور طلبا میں سے کوئی بھی سچائی بتانے کو تیار نہیں ہو رہا........... صرف ایک غیر تعلیم یافتہ چپراسی نے ہمت کی ہے!''

دونوں ''تعلیم یافتہ'' لفظ کا مذاق اڑاتے ہوئے لائبریری کی جانب چل دیئے۔

ہم خیال

غیر ملک (فارین) سے آئے ہوئے چچا جی جب بھی ملک کے حالات کو لے کر کوئی منفی تبصرہ کرتے تو غوری کو بہت برا لگتا۔ وہ سوچا کرتا کہ چچا جی بھی دوسروں کی طرح مغربی تہذیب کی رنگینیوں میں گرفتار ہو گئے ہیں اس لئے اپنے ملک کو کوستے رہتے ہیں۔

آج دوپہر کو جب فون آیا کہ غوری کا اکسیڈینٹ ہو گیا تو پورا کنبہ گھبرا گیا۔ سبھی ہسپتال کی طرف دوڑ پڑے۔

.........غوری کالج جا رہا تھا ایک ٹرک نے اسے ٹکر ماری اور ڈرائیور ٹرک کو بھگا کر لے گیا۔ وہ خون میں لت پت سڑک کے کنارے بہت دیر تک پڑا رہا۔ راہ چلتے ایک شخص نے ترس کھا کر تھانے میں خبر دی۔

رات کو جیسے ہی اسے ہوش آیا۔ پولس نے اس کے بیان لئے۔ سارا کنبہ وارڈ میں اکٹھا تھا۔ چچا جی کہہ رہے تھے ''وہاں اکسیڈینٹ ہوتے ہی آدمی کو طبی سہولتیں مل جاتی ہیں.........راہ چلتا شخص مدد کے لئے دوڑ پڑتا ہے.........اپنے یہاں تو بہت برا حال ہے.........انسانیت کی ہم صرف باتیں کرنا جانتے ہیں.........غوری آدھے گھنٹے تک مدد کے لئے لوگوں کو پکارتا رہا۔ لیکن پولس کے ڈر سے کوئی بھی آگے نہیں بڑھا۔ ہم خراب باتوں میں غیر ملکیوں کی نقل کریں گے لیکن ان سے اچھی باتیں نہیں سکھیں گے......!''

چچا جی کا وہ طنز آج فکری محور بنا ہوا تھا مگر.........غوری کو ان کی بات بری نہیں لگ رہی تھی۔

دعا

ہمیشہ کی طرح آج بھی شنکر بابو کام کرتے ہوئے اپنے آپ سے باتیں کرنے میں لگے تھے۔

...........آج جب پوجا کر کے لوٹ رہا تھا تو چوک میں لوگ باتیں کر رہے تھے کہ شہر میں تناؤ چل رہا ہے! نوراتری میں بارش نے امیدوں پر پانی پھیر دیا اور اب لڑائی، جھگڑے شروع ہو گئے! اگر بات بڑھ گئی، تو نہ لوگ ڈھنگ سے تیوہار منا پائیں گے اور نہ میری مورتیاں بک پائیں گی ......! سیاسی لوگ جنتا کو لڑواتے ہیں اور مجھ جیسے بے قصور مارے جاتے ہیں۔ میرے غریب نواز! رحم کرنا! وہ کھڑے ہو کر کمر سیدھی کرنے لگے۔ رنگ ہوتے ہی لکشمی کی اس مورتی میں جان آجائے گی۔ یہ سوچتے ہوئے وہ زمین پر بیٹھے اور مورتی کا نچلا حصہ ٹھیک کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد ان کی انگلیاں ساکت ہوئیں اور ہونٹ ہل اٹھے۔

خدا سے بہت دعا کی، اب تجھ سے بھی کر رہا ہوں ......دسہرا بگڑ گیا، اب دیوالی مت بگڑنے دینا......غریب کی دعا قبول کرنا۔

وہ کبھی لکشمی کی مورتی طرف دیکھ رہے تھے، کبھی آسمان کی طرف۔

بندھن

سُنینا ان دنوں گھر میں اکیلی تھی۔ شوہر ٹور پر گئے ہوئے تھے۔ گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر چھت پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ بغل میں اس کا دو سال کا بچہ چٹائی پر لیٹا ہوا کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔

ایک اخبار پڑھ کر اسے چار دن پہلے کا واقعہ یاد آ گیا...... کچن میں کھڑی شوہر کے حکم کا انتظار کر رہی تھی۔ رات کو بارہ بجے شوہر نے آواز لگائی ...... کھانا لاؤ......!، وہ فوراً خوان سجانے لگی۔ اسی درمیان پھر آواز آئی۔ جلدی لاؤ...... کیا کھانا لانے میں اتنی دیر لگتی ہے؟

وہ دوڑتی ہوئی آئی۔ اس نے ٹیبل پر رکھی ہوئی گلاس اور نمکین کی پلیٹ کو اٹھایا۔ ٹیبل صاف کر اس پر تھالی رکھی اور ڈری سہمی شوہر کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ شوہر نے پہلا لقمہ کھایا، وہ لڑکھڑاتے ہوئے کھڑا ہوا۔

حرام خور! ٹھیک سے کھانا بنانا بھی نہیں جانتی۔ وہ تو میں ہوں جو سب کچھ سہن کر رہا ہوں...... دوسرا کوئی ہوتا تو اب تک گھر سے نکال دیتا اور تو در در کی ٹھوکریں کھاتی!

'چٹاخ' کی آواز کمرے میں گونج اٹھی۔ ایک طمانچہ اس کے گال پر پڑا اور دھکا دیئے جانے کے سبب اس کا سر دیوار سے جا ٹکرایا۔

اس کی نظریں ابھی بھی اس خبر پر گڑی تھیں ___ پولس نے زنانہ مزدوروں کو

ٹھیکداروں کے استحصال سے آزاد کرایا۔

وہ تو استحصال کے درد سے آزاد ہو گئیں، مگر میں کیسے آزاد ہو سکتی ہوں! میں بیوی ہوں...... میں ماں ہو! اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کی آنکھیں بیٹے کو دیکھ رہی تھیں اور انگلیاں سر پر ابھری اس چوٹ کو سہلانے میں لگی تھیں۔

کنبہ

وہ آج بہت مضطرب تھے۔ زندگی کے اس پڑاؤ پر آکر ان کی کنبہ کی روایت اور اصول بکھرنے لگے تھے............اولاد نہیں ہوتی تو دکھ ہوتا ہے۔ اولاد اگر ہو کر مر جائے تو اور زیادہ تکلیف ہوتی ہے لیکن اگر اولاد اپنے والد کو ضعیف خانے چھوڑ آئے تو یہ ان سب سے بڑا دکھ ہے۔ کتنا بڑا کنبہ ہے، بیٹے ہیں، بیٹیاں ہیں، رشتے دار ہیں لیکن پورے اٹھارہ دن ہو گئے، کوئی خبر لینے نہیں آیا۔ اب تو لگتا ہے ضعیف خانے میں ہی باقی زندگی گزرے گی۔

باغیچے میں ٹہلتے ہوئے آج جب اس بورڈ کی طرف ان کی نگاہ گئی تو ان کا اضطراب اور بڑھ گیا۔ ''کائنات کنبہ ہے'' کے حروف ان کی ڈبڈبائی آنکھوں کے سامنے دُھندلے ہونے لگے۔

خلش

”.......... چچا جی! یہ ڈرائنگ روم...... یہ بیڈ روم......اس ٹائلیٹ کا سنگ مرمر میں نے راجستھان سے منگوایا تھا.......... چچا جی، یہ مورتی میں نے فارین سے منگوائی ہے.........!“

ان کے دوست کا بیٹا رمیش بہت خوش ہو کر انھیں نیا تعمیر شدہ مکان دکھا رہا تھا۔ پورے مکان کا نظارہ وہ اس طرح کر رہے تھے گویا ان کی نگاہوں کو کسی چیز کی تلاش ہو! ایک سال پہلے کا ایک منظر ان کے من میں ہلچل مچائے ہوئے تھا۔

ان کے دوست کا مردہ جسم زمین پر رکھا ہوا تھا۔ کچھ لوگ ان کے جسم کو اٹھا کر جنازہ پر رکھنا چاہتے تھے، لیکن رمیش نے انھیں پکڑ رکھا تھا۔ وہ والد کے جسم سے لپٹا ہوا (دہاڑے مار کر رو رہا تھا) بین کر رہا تھا۔ انھوں نے بہت مشکل سے اسے الگ کیا تھا۔

”چچا جی! آیئے ناشتہ لگ گیا......!“ رمیش کی یہ بات سن کر وہ اس کے پیچھے چل دیئے۔ ناشتہ کرتے کرتے رمیش نے ان سے پوچھا ”چچا جی! آپ کو گھر کیسا لگا؟“

جب انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے یہ سوال دوبارہ پوچھا۔

”بیٹا! تمہارا گھر بہت اچھا ہے.......... اپنے والد کے مکان کو تڑوا کر تم نے بہت اچھا مکان بنوایا، مگر اس گھر میں مجھے کہیں بھی میرے دوست کی کوئی تصویر نہیں دکھی......!“

چچا جی جواب چاہتے تھے اور رمیش نیچی گردن کیئے گونگا پتھر کی مورت بنا بیٹھا تھا۔

کشمکش

آج صبح سے ہی وہ کشمکش میں مبتلا ہوگئی تھی ...... ایک جانب اس کے دونوں بچے، بے روزگار شوہر اور بڑھتے ہوئے اخراجات تو دوسری جانب بچپن میں سکھائی گئی اخلاقی تربیت کا قحط، ایک طرف جواب داریاں، ذمے داریاں اور دوسری طرف باس کی خواہش۔

باس اسے کئی مرتبہ ہوٹل میں دوپہر کے کھانے کے لئے مدعو کر چکے تھے پر وہ ٹال گئی۔ اسے ان کی نگاہ اچھی نہیں لگی۔ اسی وجہ سے ناراض ہو کر وہ اس کی فائل دبا کر بیٹھ گئے۔ ان کا کہنا ماننے سے اس کی نوکری ریگولر ہونی تھی۔ اس کی تنخواہ میں دو ہزار کا اضافہ ہونا تھا۔ اگر باس نے اس کے بعد اپنی اور کوئی خواہش ظاہر کی تو......؟ اس سوال نے اس کی ذہنی کشمکش میں اور اضافہ کر دیا۔

اس نے شوہر کی طرف دیکھا۔ وہ تاش کے پتے پلنگ پر بچھائے کھیل میں ڈوبے ہوئے تھے۔

''ممی میرا ٹیوشن لگوا دو۔ آپ کے پاس وقت نہیں اور پاپا مجھے سمجھاتے نہیں! مجھے بہت سی باتیں کلاس میں سمجھ میں نہیں آتیں''۔ جب اس نے بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھ کر اپنی رضامندی دی تو بیٹی کو لگا کہ کہیں اس کا ٹرپ پر جانا ملتوی نہ ہو جائے۔ وہ فوراً بولی ''ممی! اگر میں اس بار بھی ٹرپ پر نہیں گئی تو میری سہیلیاں میرا مذاق اڑائیں گی۔

اس نے بیٹی سے کہا، بیٹا! اس بار میں تجھے ٹرپ پر بھیجنے کی پوری کوشش کروں گی''۔

اس کی نگاہیں پھر شوہر کی طرف اُٹھیں۔ وہ تاش کے پتے پھینٹ کر انھیں پھر سے پلنگ پر بچھا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ چڑھ گئی اور کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی۔

اس نے دیکھا کہ گلی کی کتیا جھاڑ کے نیچے منھ میں روٹی دبائے کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر اس کے پلے کوں، کوں کرتے ہوئے اس کے پاس دوڑ پڑے۔

کتیا زبان باہر نکالے، ہانپتی ہوئی انھیں دیکھ رہی تھی وہ سب روٹی پر ٹوٹ پڑے تھے۔ کتے کا کہیں پتا نہیں! قدرت نے صنف نازک کو ہی اتنی ذمے داریاں کیوں سونپی؟

ایک بارگی جواب داریوں اور ذمے داریوں کے بار نے سبھی پہلوؤں کو دبا دیا۔ اس نے من ہی من فیصلہ لے لیا۔ وہ کشمکش آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی۔

پوشیدہ راز

ایسا کئی دفعہ ہوا تھا۔

آج بھی اس کی انگلی برج اسد پر ٹک گئی اور وہ اپنے ماضی میں کھو گیا۔

.... پورے بیس سال ہو گئے اسے دیکھے! کیا معلوم اسے میری یاد بھی آتی ہوگی یا نہیں؟ نہ جانے کہاں ہوگی؟ اس وقت سنا تھا کہ اس کا شوہر احمد آباد میں انجینئر ہے۔ ابھی اس کی قسمت کے ستارے گردش میں ہیں۔ مولا! اسے کوئی تکلیف مت دینا! چاہے تو مجھے...... ! اسکی آنکھیں نم ہونی شروع ہو گئیں۔

بیوی اس کے چہرے کے نشیب و فراز دیکھ رہی تھی۔

''سنئے''! میں سالوں سے دیکھ رہی ہوں کہ آپ جب بھی قسمت فال دیکھتے ہیں تو برج اسد کا قسمت فال ضرور پڑھتے ہیں۔.......... جبکہ اپنے پریوار میں اس برج کا کوئی نہیں!''

بیوی کی آواز سن کر اس کے وہ آثار ٹوٹنے لگے۔

''کچھ نہیں.......... بس ایسے ہی!'' اپنے چہرے کے تاثرات کو چھپاتا ہوا وہ دوسرے کمرے کی طرف چلا گیا۔

برج اسد......، بیوی کے لئے آج بھی پوشیدہ راز بنا رہا۔

فیصلہ

ہمارا میدان سیاست کا ہے، جس میں ہمیں قدم قدم پر مصالحت کرنے پڑتے ہیں ...... اصولوں کو طاق پر رکھنا پڑتا ہے .... کل انٹرویو ہے، میں آپ سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ کرما میرا آدمی ہے اور آپ کو اسی کا انتخاب کرنا ہے۔ روی بابو کے یہ الفاظ ابھی بھی ان کے دماغ میں گھوم رہے تھے۔

.... کرما باصلاحیت کردار نہیں ہے لیکن اگر میں نے کرما کا سلیکشن نہیں کیا تو روی بابو ہر روز نئی نئی مشکلیں کھڑی کریں گے۔ وہ میرے لئے جھوٹی خبریں اچھالیں گے اسی بنیاد پر میرا تبادلہ کرادیں گے۔ تبادلے کا مطلب ہے پورے کنبے کی پریشانیاں بڑھانا......!

رات کو انھوں نے اپنا مسئلہ والد کو بتایا۔ والد صاحب نے سمجھایا ''بیٹا! آج ہمارے سماج میں دو طرح کے لوگ ہیں، ایک وہ ہیں، جن کے لئے ملک ابھی بھی انگریزوں والا ''انڈیا'' ہے۔ وہ غیر اصولی ہیں، مگر اثر ورسوخ والے ہیں۔ دوسرا طبقہ اسے ''بھارت'' ماننے والوں کا ہے۔ جسے اپنے اصولوں کے سبب قدم قدم پر پریشانی اٹھانی پڑ رہی ہے......... شرمندہ ہونا پڑ رہا ہے۔ تم سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا.........!''

سکینہ جی نے والد کی بات پر بہت غور وفکر کیا۔ آخر کار انھوں نے باصلاحیت امیدوار کو منتخب کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

صبح دفتر جاتے وقت بیوی ان سے مخاطب ہوئی، '' کل میں آپ کی اور والد صاحب کی باتیں سن لی تھی۔ اچھی طرح سن لیجئے ...... یہاں بہت اچھے اسکول ہیں، اگر

یہاں سے تبادلہ ہو گیا تو یہ بچوں کے مستقبل کے ساتھ ظلم ہو گا!''

دوسرے دن والد صاحب جب مندر سے درشن کر کے گھر لوٹے تو روی بابو کی کار کو گیٹ کے سامنے کھڑا دیکھ کر متحیر ہو گئے۔

''سکینہ صاحب! آپ اسی طرح آپسی معاونت بنائے رکھیں گے تو ہمارے تعلقات ہمیشہ بنے رہیں گے!'' گھر میں داخل ہوتے ہی روی بابو کی آواز ان کے کانوں تک پہنچ گئی...... انھیں پختہ یقین ہو گیا کہ ''انڈیا'' کے آگے ''بھارت'' گھٹنے ٹیک چکا ہے۔

مصالحت

دفتر سے آنے کے بعد سے ہی جے پرکاش جی کاغذ پر ماہانہ بجٹ بنانے میں لگے تھے۔ وہ کئی مہینے سے سریتا کو ساڑی دلانے کی سوچ رہے تھے۔ لیکن کوئی نہ کوئی اتفاقیہ خرچ ایسا آجاتا کہ انھیں مصالحت کرنا پڑتا۔ اس مہینے دسہرے کا زائد خرچ بڑھ گیا تھا۔ مگر بہت کھینچ تان کر انھوں نے سریتا کی ساڑی کے لئے جگہ بنالی تھی۔ ایک گھنٹے دماغ سوزی کے بعد ملی اس کامیابی سے وہ من ہی من خوش ہو رہے تھے۔

''سنئے! آشیش پھٹے جوتے پہن کر اسکول جاتا ہے، سر اسے سب کے سامنے دوبار ٹوک چکے ہیں، مجھے تو ڈر لگتا ہے کہ کہیں وہ احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو جائے ...... اسے معلوم ہے کہ گھر کے اخراجات مسلسل بڑھ رہے ہیں، اس لئے وہ آپ سے کہنے کی ہمت نہیں کر پا رہا ہے''۔

سریتا کی بات سن کر ان کے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا۔ سریتا ان کی ذہنی کیفیت سمجھ گئی تھی۔

''سنئے! اس بار آپ آشیش کی خواہش پوری کر دیجئے۔ .... آپ میرے لئے اتنا سوچتے ہیں ...... میرا اتنا خیال رکھتے ہیں ...... اس سے میرے ذہن میں کتنی خوشی ہے، آپ نہیں سمجھ سکتے ...... ساڑی کا کیا ہے وہ آئندہ ماہ دلا دیجئے گا۔

جے پرکاش جی نے دیکھا کہ سریتا کی آنکھیں خوشی و غم سے لبریز ہو گئی تھیں۔

''سریتا'' ، تم کتنی سمجھدار ہو ...... یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے تمہاری جیسی بیوی ملی'' یہ کہتے ہوئے انھوں نے جیب سے قلم نکالا کاغذ پر جہاں سریتا کی ساڑی لکھا تھا، اسے کاٹ کر، وہاں 'آشیش کے جوتے' لکھ دیا۔

اپنی اپنی خوشی

''سر! پانی............!''

سنجو کی آواز سن کران کے کاپی جانچتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔انھوں نے اس کی طرف دیکھا۔وہ سبھی اساتذہ کو پانی پلاتا ہوا ان کی طرف آرہا تھا۔

......مئی ماہ کی اس جھلسا دینے والی گرمی میں اس کا ٹھنڈا پانی بہت راحت پہنچاتا تھا۔Evalution Room میں پانی پلانے والے کئی لڑکے ہیں لیکن ایک یہی ہے جس کے گلاس ہمیشہ چمکتے رہتے ہیں۔روزانہ تو یہ آدھے، پون گھنٹے کے وقفے میں آتا تھا مگر آج بہت خوش دکھائی دے رہا ہے۔اس لئے بار بار چکر لگا رہا ہے۔انھیں آج اس کی مستعدی، چُستی، پھُرتی کچھ زیادہ نظر آئی۔

وہ کبھی کبھی اسے چائے کے لئے روپے دے دیا کرتے اور اس کی خیریت پوچھ لیا کرتے تو وہ مسرور ہو جایا کرتا۔

گاؤں کے اس لڑکے کے چہرے پر کتنی معصومیت ہے۔یہ سوچتے ہوئے انھوں نے اس کے ہاتھ سے گلاس لیا اور پانی پینے لگے۔

اس کے آگے بڑھتے ہی وہ کاپی جانچنے میں منہمک ہو گئے۔اپنا کام ختم کرنے کے بعد انھوں نے کاپیوں کا بنڈل کاؤنٹر پر جمع کرایا۔وہ باہر نکل رہے تھے۔تبھی انھیں سامنے سے سنجو آتا ہوا نظر آیا۔وہ گیٹ پر ڈیوٹی دے رہے گارڈ کو پانی پلا کر لوٹ رہا تھا۔

لمحے بھر کے لئے وہ ان کے پاس ٹھہرا، پھر بولا''سر! آج میری شادی کی پہلی سالگرہ ہے اس لئے میں بہت خوش ہوں......آج میں نے سبھی کو خوب پانی پلایا''۔

''......تو کیا بیوی تمہارے ساتھ رہتی ہے......؟''

''نہیں سر...... وہ گاؤں میں اپنے والدین کے گھر انھیں کے ساتھ رہتی ہے...... شادی تو ہوگئی، لیکن ''گوَنا'' ہونا ابھی باقی ہے۔''

وہ جا چکا تھا، مگر وہ وہیں متحیر ساکت کھڑے تھے۔

بیٹا

دو ماہ ہو گئے ابو جی کو دیکھے ....! کبھی اس بیچ وہ چل بسے ہوں گے تو ......؟اس سوال نے اسے اداس کر دیا اور وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

کاش! میں ابو جی کو ضعیف خانہ بھیجنے کی کھل کر مخالفت کیا ہوتا تو ان کی یہ حالت نہیں ہوتی۔ ماں کے نہیں رہنے پر بھی وہ اتنے نہیں ٹوٹے تھے جتنے کہ اب! میں شوبھا سے اتنا ڈرتا کیوں ہوں؟

ضعیف خانہ جاتے وقت وہ کیسی حسرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ٹھیک ایسا ہی اس وقت بھی ہوا تھا۔ جب ضعیف خانے سے انھیں دماغی ہسپتال لے جایا جا رہا تھا۔ اسے بھی وہاں بلا لیا گیا تھا۔ وہ اسٹریچر پر لیٹے ہوئے تھے......رسی سے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے تھے۔ وہ وہیں کھڑا تھا..........ابو جی کی نگاہیں اس پر ایسی ٹک گئیں کہ جہاں تک وہ نظر آیا وہ اسی کو دیکھتے رہے۔ وہ مجبور کھڑا رہ گیا اور ایمبولینس انھیں لے کر نکل گئی۔

......ابو جی نے مجھے پڑھایا، لکھایا اور اس قابل بنایا کہ آج میرا سماج میں سمان ہے۔ کتنی دھوم دھام سے انھوں نے میری شادی کی تھی۔ ان دنوں وہ کتنے خوش تھے، وہ کہا کرتے تھے کہ شوبھا میری بہو نہیں بیٹی ہے......لیکن شوبھا ان سے نفرت ہی کرتی رہی۔

......ابو کے ضعیف خانہ جاتے ہی شوبھا کی آزادی اور زیادہ ہو گئی۔ ان دنوں جو اس کی کیٹی پارٹی چلتی رہتی ہے۔ اسے سمجھانا بے کار ہے......کیونکہ اس کے سمجھانے کا مطلب ہے اس کے غصے کو جھیلنا......پھر چاہے وہ کوئی چیز پھینکے یا کوئی طوفان کھڑا کرے۔ اسی کی ضد کے سبب اسے ابو جی کو ضعیف خانہ بھیجنے کا فیصلہ لینا پڑا! آج میرے

پاس سب کچھ ہے مگر ابو کو گھر میں رکھنے کی ہمت نہیں! بڑھاپے میں ہی تو باپ کو بیٹے کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی وقت میں نے انھیں اپنے سے دور کر دیا۔

وہ ساری رات سو نہیں سکا۔ ابو جی کی حسرت بھری نگاہیں اس کا پیچھا کرتی رہیں۔ صبح اٹھتے ہی اس نے من ہی من ارادہ کیا کہ آج وہ چھٹی لے کر ابو جی سے ملنے جائے گا۔ دفتر جانے کا بہانا کر کے وہ گھر سے نکلا۔

''کیوں بھائی! ناتھولال جی، شرما جی کس کمرے میں ہیں......!''

ہسپتال کے اندر بینچ پر بیٹھے چپراسی سے اس نے پوچھا۔

''ناتھولال جی کے بیٹے ہو......!''

''جی......!''

''اتنے دنوں بعد یاد آئی اپنے باپ کی...... باپ تمہارا ہے اور ہم لوگ اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں......! داہنی جانب چوتھے کمرے میں انھیں رکھا ہے۔ جاؤ مل لو!'' چپراسی نے اسے سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے کہا۔

جیسے جیسے کمرہ قریب آنے لگا، اس کی چال دھیمی ہونے لگی۔ کھڑکی کے پاس جا کر وہ رک گیا۔ کھڑکی سے اس نے اندر نظریں دوڑائیں۔ دوسرے دو، تین مریض نظر آئے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ چپراسی بینچ پر بیٹھا ابھی بھی اسے گھور رہا تھا۔

کمرے کے اندر جاؤں گا تو ابو جی کی حسرت بھری نگاہیں...... کبھی وہ گھر چلنے کی ضد کر بیٹھے تو؟ شوبھا تو میری مشکل کر دے گی! پیچھے لوٹتا ہوں تو وہ چپراسی۔ یہ سوچ کر اس کا دل زور زور سے دھڑک اٹھا۔

ہسپتال کے پیچھے سے بھی باہر نکلنے کا راستہ ضرور ہوگا! یہ سوچتا ہوا وہ تیز قدموں سے کمرے کے سامنے سے نکل گیا۔

عزت

سپاہی نے پورا واقعہ سن کر، اس کے سامنے سوالوں کی جھڑی لگا دی۔

"جب وہ تیرے ساتھ زیادتی کر رہا تھا تو تو چلائی کیوں نہیں؟ جب کھیت سن سان پڑا تھا تو، تو اس طرف کیوں گئی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تو روپئے کے لالچ میں اس پر کیچڑ اچھال رہی ہے؟ اس کا بھائی گاؤں کا سرپنچ ہے، اسے بڑے بڑے لوگ جانتے ہیں ...... سن! وہ تو بچ جائے گا، پر تیرا گھر اجڑ جائے گا۔ کون کرے گا تیرے بچوں سے شادی ......؟

وہ مسلسل روئے جا رہی تھی، سپاہی کی بات سن کر شوہر اسے سمجھانے لگا ......" صاحب سچ کہہ رہے ہیں ...... انھیں کے کھیت میں ہمیں کام کرنا ہے ...... ہمیں مزدوری ملنی بند ہو جائے گی۔ کملی! تو میرا کہنا مان، گھر چل ...... ابھی تو اپنی ہی عزت گئی ہے، اگر برادری والوں کو معلوم ہو گیا تو پھر بچوں کی بھی عزت خراب ہو جائے گی"۔

نشانہ سہی جگہ لگا تھا۔ اس کام کے لئے سرپنچ صاحب سے وہ پانچ ہزار سے کم نہیں لے گا۔ آخر ان کے لئے بھی تو یہ عزت کی بات ہے۔ یہ سوچ کر سپاہی خوش ہو گیا۔ کملی اپنے شوہر کے کندھے کا سہارا لیتی ہوئی پولس چوکی سے باہر نکلنے لگی۔

ٹوٹی گھڑی

کسی چیز کو ڈھونڈتے ہوئے جب وہ ابو جی کے کمرے میں پہنچے تو ان کا دھیان لکڑی کی الماری میں رکھی ٹوٹی گھڑی کی طرف چلا گیا۔

''ابو جی! میں اس گھڑی کو اٹالے میں رکھ آیا تھا، آپ پھر اسے لے آئے۔''

''یہ گھڑی یہیں رہے گی۔'' انھیں گھڑی کی جانب بڑھتے دیکھ کر ابو بولے۔

''ابو جی! یہ گھڑی ٹوٹی ہے۔ میں آپ کے لئے نئی گھڑی لے آؤنگا، تب تک آپ اپنے کمرے میں لگی دیوار گھڑی سے کام چلالیں۔'' یہ کہتے ہوئے انھوں نے گھڑی کو اٹھالیا۔

''یہ گھڑی یہیں رہے گی۔'' ابو جی دہاڑے۔

وہ حیرت میں کھڑے سوچ رہے تھے کہ ابو بوڑھاپے میں سٹھیا گئے ہیں۔

جب ابو نے انھیں ایک ٹک اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تو بولے۔

''بیٹا! جب مجھے پہلی تنخواہ ملی تھی تو تمہاری ماں نے یہ خرید کر مجھے تحفے میں دی تھی۔ اسے یہیں رکھی رہنے دو۔''

یاد ماضی سے متاثر ابو کی آواز یکا یک رک گئی۔

انھوں نے ابو کا چہرہ دیکھا اور گھڑی کو اسی جگہ رکھ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

ناانصافی

اس بار قومی دن پر اس تاریخی عمارت کی مرمت اور سجاوٹ ہوئی۔ پوری عمارت چم چما اٹھی۔

بلندی پر بیٹھے خوبصورت گنبد اور منقش ستون میں گفتگو ہونے لگی۔ آج وہ دونوں خوش تھے۔

''گنبد بھائی! آج کتنے بڑے بڑے لوگ یہاں آئے۔ آج کا دن میرے لئے یادگار بن گیا۔ ہم تو سوچ رہے تھے کہ ہماری زندگی تنگ حالی میں گزر جائے گی۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ساڑھے پچپن سال بعد ہی سہی، سرکار کو ہماری یاد تو آئی۔ بھائی آزادی سے پہلے آپ پر انگریزوں کا پرچم لگا کرتا تھا پر آج تو ترنگا لہرا رہا ہے!''

اس کی بات سن کر گنبد کا سینا خوشی سے پھول گیا جیسے ہی ان کی باتیں ختم ہوئیں عقب سے ایک دھیمی آواز ابھری! ...... آپ لوگوں نے بھی رہنماؤں کی طرح مجھے بھلا دیا!''

وہ دونوں لاجواب ہو کر بنیاد کی طرف دیکھنے لگے۔

دانا اور مرغا

آج بھاٹیا جی نے ان تینوں کو آفس سے چھوٹنے کے بعد کافی ہاؤس میں یہ کہہ کر بلایا کہ صاحب کے متعلق ایک مخصوص راز ہاتھ لگا ہے۔

وقت مقررہ پر وہ سب وہاں پہنچ گئے۔

سبھی کی نگاہیں بھاٹیا جی پر ٹکی تھیں۔

''یہ مرغا ہے، اس لئے زیادہ بانگ دے رہا ہے، میں جان گیا ہوں کہ اس کی اصولی باتیں صرف دکھاوا ہیں۔ دوپہر کو مجھے موبائل پر ایسی خبر ملی ہے جسے سن کر آپ سب جھوم اٹھیں گے''۔ یہ کہہ کر بھاٹیا جی نے سگریٹ سلگائی اور دھواں چھوڑتے ہوئے بولے۔

''اس کا تقرر لے دے کر ہوا ہے۔ آپ ہی بتائیے جس نے اپنا تقرر روپیا دے کر کروایا ہو وہ بھلا روپئے سے کیسے پرہیز رکھ سکتا ہے؟ اگر آپ سب متفق ہوں تو کل کسی ہوٹل میں انھیں رات کے کھانے پر بلایا جائے اور وہیں پر دانے پھینکے جائیں! میرا من بولتا ہے کہ یہ دانا چگنے والا مرغا ہے۔''

اتفاق رائے سے سب کے سر ہل اٹھے۔

ذہنیت

دور سے سکینہ کو اس طرف آتے دیکھ کر ان دونوں کی چال دھیمی ہو گئی۔

ہمارے تفریح کا وقت ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی وقت یہ کافی ہاؤس میں جانے کے لئے گھر سے نکلتا ہے، اس کے سات روپئے روز کے بچ سکتے ہیں لیکن یہ اپنی عادت سے مجبور ہے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ یہ تھا تو ہیڈ کلرک، لیکن اپنے آپ کو آفیسر سے کم نہیں سمجھتا تھا، اگر یہ ہم لوگوں کی طرح آفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہوتا تو نہ جانے کیا کرتا؟''

''یار! تمہارا میرا پریوار ہے، بچے ہیں، ان کے مسائل اور ضرورت ہیں، لیکن یہ تو لاولد ہے، اس لئے روز کافی ہاؤس کی مستی لیتا ہے!''

''سر! آداب! کہتا ہوا سکینہ کب کا جا چکا تھا۔ لیکن دماغ میں موجود سکینہ انھیں ابھی بھی مجروح کر رہا تھا۔

عاجزی

چھوٹے اور بڑے صندوق ملا کر اس پر سفید چادر بچھائی گئی، اس پر لکشمی کی تصویر اور پوجا کی اشیاء رکھ دی گئیں۔

وہیں ایک پرانی چاندی کی طشتری میں دو اور پانچ کے سکے ڈال کر وہاں رکھ دیا گیا۔ کمرے میں دری بچھائی گئی۔ کنبے کے سبھی لوگ ابو جی کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔

گھڑی کو دیکھ جب ماں کے چہرے پر فکر کے آثار نمودار ہوئے تو بیٹا انھیں سمجھانے لگا...... "ماں! جس دوکان میں ابو جی سیلس مین ہیں جب تک وہاں پوجا نہیں ہوتی تب تک وہ کیسے آسکتے ہیں؟"

"لیکن بیٹا! مبارک گھڑی تو نکلی جا رہی ہے...... صرف پانچ منٹ ہیں" یہ کہہ کر ماں دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

سائیکل کی آہٹ سے سبھی کے چہرے کھل اٹھے! ابو جی ہانپتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ تھیلی کو کونے میں رکھ کر، انھوں نے ہاتھ پاؤں دھوئے اور فوراً پوجا میں بیٹھ گئے۔

"لکشمی ماتا! کم سے کم اتنا رحم ضرور کرنا کہ کنبے کو عزت اور دونوں وقت کی روٹی ملتی رہے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو مجھے بے حد تکلیف ہوگی کہ میں اپنا معمولی فرض بھی پورا نہیں کر سکا۔" آنکھیں پونچھتے ہوئے ان کا دھیان بیوی کی طرف چلا گیا۔

وہ ابھی آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی اور اس کی آنکھوں کی پلکیں نم ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ شاید وہ بھی یہی عاجزی کر رہی ہے۔ ان کی آنکھیں بیوی کے چہرے پر ٹک گئیں۔

شکار

امتحانی جوابی کاپیوں کے بنڈل کم ہی بچے تھے اس لئے سینٹرل جانچ کمرے کے باہر وقت سے پہلے ہی اساتذہ کی بھیڑ لگنی شروع ہوگئی۔

رزلٹ انچارج نے آتے ہی کمرے کی چابی گیادین چپراسی کو دی وہ تالا کھولنے لگا۔ دروازہ کھلتے ہی سبھی اساتذہ تیزی سے اندر کی طرف دوڑ پڑے۔ ان کے دھکے سے گیادین گرتے گرتے بچا لیکن کسی کی بھی توجہ اس بوڑھے کی طرف نہیں گئی! وہ اساتذہ کو گھورتا ہوا اس طرف جانے لگا جہاں اس کے دیگر ساتھی کھڑے تھے۔

کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی اساتذہ رجسٹر پر دستخط کرنے میں پہل کرنے لگے۔ جب صرف دو بنڈل بچے تو دستخط کرنے کے لئے اٹھے ہاتھ اور تیز رفتار ہو گئے کہ اس نادانی میں 'چر' کی آواز سے رجسٹر کا کاغذ پھٹ گیا۔ سبھی ہاتھ لمحہ بھر کے لئے رک گئے۔

سارا منظر دیکھ کر گیادین تمبا کو مسلتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہنے لگا...... ''اساتذہ کو ایسا کرتے دیکھ کر مجھے اپنے گاؤں کے چیل کووے یاد آ گئے۔ وہ بھی اپنے شکار پر ایسے ہی ٹوٹ پڑتے تھے۔''

اُصول پسند

وہ پل کے اوپر کھڑا تھا اور وہاں سے نیچے چھلانگ لگانے ہی والا تھا، تبھی 'چر چر' کی آواز سن کر چونک اٹھا۔

کار سے اترتے ہوئے آدمی نے چلاتے ہوئے کہا: ''اچھے خاصے جوان آدمی ہو...... کیوں مرنا چاہتے ہو؟''

''جی...... جی...... میں گھر والوں کے تانے سن کر شہر میں نوکری کی تلاش میں آیا تھا...... گریجویٹ ہوں، لیکن چھ ماہ سے در در کی ٹھوکریں کھاتا گھوم رہا ہوں...... اس کیڑے مکوڑے کی طرح جینے والی زندگی سے میں تنگ آ گیا ہوں۔''

''سنو! میں تمھیں ایسا کام دونگا کہ کچھ دنوں میں تم مالا مال ہو جاؤ گے......!''

''......لیکن صاحب! غلط کام سے مجھے ڈر لگتا ہے!''

''موت سے نہیں ڈرتے اور غلط کام سے اتنا ڈرتے ہو......!''

''صاحب! میں عزت سے زندگی تو نہیں گزار پایا مگر عزت سے مرنا ضرور چاہتا ہوں!''

چھپاک کی آواز سے ماحول گونج اٹھا۔

سایہ

آج پھر اس کا وہ سایہ جاگ اٹھا اور وہ بے چین ہو گیا۔

وہ آدمی ابھی بھی بے ہوش ہے...... شاید اسے دل کا دورہ پڑا ہے...... اس کے ہاتھ کی انگوٹھی اور گلے کی موٹی سونے کی چین بتا رہی ہے کہ وہ بہت مالدار ہے۔ دس منٹ بعد تمہارا اسٹیشن آجائے گا تم اس کا سوٹکیس لے کر اتر جاؤ، اس میں بہت مال ہوگا، سنو! جب تم بھاگ کر ٹرین پکڑ رہے تھے تو یہی ایر کنڈیشن ڈبہ تمہارے سامنے کیوں آیا......؟ خدا نے تمہیں یہ موقع دیا ہے، اسے ہاتھ سے مت جانے دو!

نہیں...... یہ بہت اچھا آدمی ہے...... ٹائلیٹ سے نکلتے وقت جب اس نے مجھے گیٹ پر کھڑا دیکھا تو مجھے کیبن میں بیٹھایا...... میں نے منع بھی کیا لیکن اس نے مجھے پھل کھلائے۔ اس کے ساتھ ایسا کرنا انسانیت کے خلاف ہوگا......!

'ارے بیوقوف! انسانیت کی باتیں اب صرف تقریروں اور کتابوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ عملی سماج میں ان کی کوئی پاسداری نہیں کرتا۔'

'نہیں......نہیں......آج میں تمہاری کسی بات پر عمل نہیں کروں گا؟'

کیا ہو گیا تمھیں ......؟ تمہاری نوکری چھوٹ گئی، تمھیں روپیوں کی سخت ضرورت ہے اور تم فضول کی باتیں کر رہے ہو!'

'جب میں اپنے دوستوں کو شراب پینے سے منع کر چکا تھا، تب تمھیں نے مجھے شراب پینے کے لئے اکسایا تھا۔ لیکن آج میں تمہارے کسی بھی لالچ میں نہیں پھنسوں گا!'

اچانک 'پانی، پانی' کی آواز سن کر وہ چونک اٹھا۔

اس نے اس آدمی کے منہ میں پانی ڈالا۔اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

''بیٹا! میرے کوٹ کے اندر کی جیب مین گولیاں ہیں ......اسے فوراً نکال کر مجھے کھلادو، ورنہ میری جان نکل جائے گی!''

اس نے فوراً دوا نکالی اور اس کے منہ میں رکھ دی۔

اسے ہوش آنے لگا۔

''تم اگر اس وقت مجھے پانی نہیں پلاتے، دوائی نہیں کھلاتے تو میں اب تک مر چکا ہوتا۔تم میرا کارڈ اپنے پاس رکھو، تمھیں جب بھی کسی چیز کی ضرورت ہو، بلا جھجھک مجھ سے مل سکتے ہو۔میں زندگی بھر تمھارا احسان مندر ہوں گا۔'' اس آدمی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا، گاڑی پلیٹ فارم پر رینگنے لگی۔

آج میں نے اس سایہ کو ہمیشہ کے لئے اپنے سے جدا کر دیا۔اب کتنا سکون محسوس کر رہا ہوں۔گاڑی رکنے کے انتظار میں وہ گیٹ پر کھڑا تھا۔

حساب

ہمیشہ سفید اور کلف دار کپڑے پہننے والے وشال بابو آج پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ ان کا رنگ کالا پڑ گیا تھا اور کپڑے بھی گندے تھے۔ وہ ابھی ابھی دیہی علاقے کا دورہ کر کے لوٹے تھے۔ ان کے داخل ہوتے ہی گھر میں چہل پہل شروع ہو گئی۔ بیوی ملازموں کو حکم دینے لگی۔ ایک ملازم گرم پانی کا ٹب لے کر دوڑا اور دوسرا اس میں نمک ڈالنے لگا۔

اپنے رشتے داروں سے گھرے ہوئے وہ دونوں پاؤں ٹب میں ڈال کر بیٹھ گئے اور ان سے الیکشن کی جان کاری لینے لگے۔

''پورے دو دن بعد آپ آ رہے ہیں .... نہ وہاں آپ کو ڈھنگ سے کھانا ملا ہوگا اور نہ ہی آپ سو پائے ہوں گے۔ آپ کچھ دیر خاموش آنکھیں بند کر کے بیٹھیں تو آپ کو بہت آرام ملے گا''۔ بیوی کی بات کو نظر انداز کر کے موبائل پر رضا کاروں کو آرڈر دینے لگے۔

جیسے ہی ان کی بات ختم ہوئی، ان کا دس سالہ بیٹا بول اٹھا ممّی ! دیکھو، پاپا کے پاؤں سوج کر کتنے موٹے ہو گئے ہیں پاپا! آپ پیدل کیوں گھومتے ہیں ......؟ آپ کار میں کیوں نہیں گھومتے ؟''

اس معصوم بچے کو الیکشن کا حساب کیسے سمجھاؤں ......؟ ان چند دنوں کی محنت پر ہی تو میرا پانچ سال کا شاہی عیش و آرام بھرا جیون منحصر ہے ! وہ مسکرا دیئے۔

ندامت

دونوں محل کے دروازے پر پہرہ دیتے ہوئے بار، بار قلعے کے اوپر لگے پرچم کو دیکھ لیتے۔ چند گھنٹے پہلے ہی اسے بدلا گیا تھا۔

''پوروگڑھ کا سارا شاہی نظام ہی بدل گیا! نئے راجا آ گئے۔ ہماری حکومت پر دشمنوں کا قبضہ ہو گیا۔ کاش! آخری وقت تک ہماری ہمت نہیں ٹوٹتی! ان کے مٹھی بھر فوجی ہی بچے تھے۔ انھیں ہم شکست دے سکتے تھے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو...... ! ہتھیار ڈالنے کی صلاح ہم نے ہی تو فوجی سربراہ کو دی تھی۔ اوف! اس بوجھ کو لے کر ہم کیسے زندہ رہیں گے؟''

چند لمحہ خاموشی رہی، پھر دوسرے کی آواز آئی ...... ''دوست! ہم تاریخ کے وہ سیاہ صفحات بن گئے ہیں جسے پڑھ کر لوگ ہمیں بزدل کہیں گے۔ ننگِ وطن اور غدار کہیں گے......!''

دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ دوسرے ہی لمحہ وہ خون آلود ہو کر زمین پر گر پڑے۔

دونوں کی تلواریں ایک دوسرے کے پیٹ میں پیوست ہو چکی تھیں۔

فکر

بے چاری ومِلا! جب اسے شوہر کو فون پر یہ کہتے سنا...... 'اب چناؤ کا خرچ ہزاروں سے بڑھ کر لاکھوں میں پہنچ گیا ہے، قدم قدم پر دولت کی ضرورت پڑتی ہے، ابھی آپ جو بھی مدد کریں گے، میں جیتنے کے بعد کئی گنا فائدہ آپ کو دلوا دوں گا!'' تب سے وہ بہت فکر مند تھی۔

کہاں سے آئے گی اتنی رقم......؟

اگر گھر کا سب کچھ مال و اسباب ان کے انتخاب میں لگ گیا اور یہ انتخاب ہار گئے تو گھر کا خرچ کیسے چلے گا؟ صبح شوہر اتنی جلدی میں تھے کہ وہ چاہ کر بھی ان سے اس موضوع پر کچھ پوچھ نہیں پائی۔ رات کو گھر میں داخل ہوتے ہوئے شوہر نے ان کے ہاتھ میں ایک بیگ دیا اور بولے۔ 'اسے حفاظت سے رکھنا، اس میں روپۓ ہیں'۔

''اچھا ہوا جو روپیوں کا انتظام ہو گیا۔ میں صبح سے بہت پریشان تھی کہ روپیہ کہاں سے آئے گا؟''

بیوی کی بات سن کر شوہر بولے۔ ومِلا! ''تم بہت بھولی ہو...... اس رقم کو انتخاب میں نہیں لگانا ہے۔ انتخاب کے خرچ کا انتظام تو میں پہلے ہی کر چکا ہوں اگر میں چناؤ ہار گیا تو یہ روپۓ گھر کے کام آئیں گے''۔

یہ کتنے اچھے ہیں۔ کنبے کی انھیں کتنی فکر ہے...... میں خواہ مخواہ ہی فکر مند تھی۔ مسکراتے ہوئے اس نے شوہر کو دیکھا اور بیگ سے نوٹ کے بنڈل نکال کر الماری میں رکھنے لگی۔

پریم چند کا سچ

وہ پوری یونیورسٹی میں ماہر پریم چند ادب سے مشہور تھے۔ اسی وجہ سے انھیں ''یوم ولادت پریم چند'' پر ہونے والے پروگرام کا صدر بنایا گیا تھا۔

کل انھیں ایک انٹر کالج میں ہندی لکچرر کا تقرر کرنے کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔

اسٹیج پر بیٹھے بیٹھے انھیں کل کا وہ انٹرویو یاد آ گیا۔

''کیوں بیٹا! کیا آپ نے منشی پریم چند کو پڑھا ہے؟''

''جی سر!''

''ان کی کون کون سی تخلیقات آپ نے پڑھی ہیں؟''

''جی...... 'کفن' اور 'گئودان'۔

''یہ تو تمھارے کورس میں تھیں...... اس کے علاوہ تم نے ان کی کون سی تخلیق پڑھی ہے؟''

ان کے اس سوال کا جواب دس میں سے کوئی بھی امیدوار نہیں دے پایا۔

اپنے صدارتی خطاب کے آخر میں انھوں نے طلباء میں آرہی ادبی مطالعے کے معیار کی کمی پر افسوس ظاہر کیا اور فرمائے ''یہ تو اچھا ہوا کہ منشی پریم چند کو کورس میں شامل کیا گیا ورنہ وہ بھی دوسرے بڑے فنکاروں کی طرح محض کتب خانے کی زینت بن کر رہ جاتے''۔

چیلنج

ملازم بھیرولال گرم گرم روٹیاں پلیٹ میں لئے کھڑا تھا اور وہ بیوی کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔

''چناؤ میں آپ کی ذمے داری بہت بڑھ گئی ہے...... آپ کو پورے ضلع میں دورہ کرنا پڑتا ہے۔ پورے اٹھارہ گھنٹے کے بعد آپ کا گھر آنا ہوا ہے۔'' بیوی نے کہا۔

''منتظم آفیسر (Administartive Officer) کے لئے چناؤ لڑکی کی شادی سے کم اہم نہیں ہوتا ہے۔ اب مشینیں آ گئی ہیں، اس لئے کام تھوڑا کم ہو گیا ہے اور چناؤ بھی پہلے سے زیادہ غیر جانب دار ہو گئے ہیں۔'' اپنی گفتگو پوری کر کے صاحب نے لمحے بھر کے لئے توقف کیا۔ پھر مخاطب ہوئے۔ ''تم ووٹ ڈالنے گئی تھی''؟

''جی...... میں دوپہر کو ہی ڈال آئی۔''

صاحب کا دھیان یکا یک بھیرولال کی طرف چلا گیا۔

''کیوں، تم نے ووٹ ڈالا کہ نہیں......؟''

''نہیں...... صاحب!''

''کیوں؟'' صاحب نے تعجب ظاہر کیا۔

''صاحب! رات کو ہماری بستی میں شراب، ساڑی اور کمبل بانٹے گئے۔ جن جن لوگوں کو ملے، وہ ووٹ ڈال آئے۔ ہمیں نہیں ملے، اس لئے ہمارا پورا پریوار ووٹ ڈالنے نہیں گیا۔''

یہ کہہ کر شہادت کے لئے بھیرولال صاحب کو اپنی انگلی دکھانے لگا۔ صاحب تذبذب میں پڑ گئے۔ اس کی انگلی میں سیاہی کا نشان نہیں تھا۔ جو کچھ دیر پہلے بولے گئے ان کے غیر جانب دارانہ قول کو چیلنج کر رہا تھا۔

جانچ

سکھ دیو جی کو جیسے ہی وہ افسوس ناک خبر ملی وہ پریشان ہو گئے۔

انھوں نے فوراً اسکوٹر کو رمیش بابو کے گھر کی طرف موڑ دیا۔ وہ ادبی ذوق کے انسان تھے۔ اس لئے ان کی ان سے دوستی تھی۔

ابھی کچھ روز پہلے تو وہ گھر آئے تھے۔ ڈاکٹر نے انھیں قلبی مریض بتایا تھا۔ کہنے لگے۔ ''سکھ دیو جی! زندگی میرے ہاتھ سے پھسلتی جا رہی ہے۔ سرجری کرانے کا روپیا میرے پاس نہیں ہے۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ پارٹ ٹائم نوکری کر کے جیسے تیسے پریوار چلایا۔ نہ بیٹے کی نوکری لگ پائی اور نہ ہی بیٹی کی شادی ہو سکی۔ میں ایسی کہانی بننا چاہتا تھا جو ہمیشہ یاد رکھی جائے، لیکن روٹی کپڑا اور مکان میں ایسا الجھا کہ ایک معمولی اور ادھورا کردار بن کر ہی رہ گیا۔

وہ انھیں سمجھانے لگے۔ 'رمیش بابو' آپ نے اپنی جانچ ٹھیک طرح سے نہیں کرائی۔ آپ نے کبھی کسی کو تکلیف نہیں دیا۔ نہ کبھی کسی سے ایک روپئے کی خواہش رکھی۔ آپ نے پوری زندگی ایمانداری سے گزاری، پھر آپ کیوں افسوس کر رہے ہیں؟ آپ بھول گئے کہ کہانی کا وجود آپ جیسے کرداروں سے ہی ہوتا ہے۔

کفن دفن کے بعد سبھی گھر کی طرف لوٹ رہے تھے۔ سکھ دیو جی کے من میں ابھی بھی کہانی اور ادھورے کردار والی وہ بات گھوم رہی تھی۔ ان کے قریب رمیش بابو کا بیٹا چل رہا تھا۔ وہ روتے ہوئے ان سے بولا ''چچا جی! ابو جی کل آپ کو یاد کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ آپ نے انھیں جینے کی نئی طاقت دی اور آج وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔''

وہ اسے دو لفظ صبر کی تلقین کے کہنا چاہتے تھے لیکن ان کی آواز ان گلے میں دب کر رہ گئی۔

بیچاری تختیاں

آفس کے اس کونے والے کمرے میں، جہاں ٹوٹی پھوٹی چیزیں رکھی جاتی تھیں وہ وہیں رکھی رہتیں۔ آج اس کمرے کا تالا کھلا ہوا تھا۔ انھیں باہر نکالا گیا اور جھاڑ پونچھ کر جلسہ گاہ کے چاروں طرف لگا دیا گیا۔

پروگرام شروع ہونے میں ابھی وقت تھا۔ بڑے صاحب وہاں انتظام دیکھنے آئے۔ آفیسر انھیں خوش کرنے کے لئے بولا ''سر! عظیم شخصیتوں کے مادری زبان سے متعلق ضرب المثل خیالات سے مزین ان تختیوں کے دیوار پر لگتے ہی جلسہ گاہ کھل اٹھا۔''

بڑے صاحب نے تعریفی نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولے، ''یو آر ویری اسمارٹ''۔

پروگرام ختم ہوتے ہی بڑے صاحب نے اس آفیسر سے کہا، ''ان تختیوں کو وہیں حفاظت سے رکھوا دینا...... آئندہ ۱۴ ستمبر کو پھر ان کی ضرورت پڑے گی۔''

آفیسر نے فوراً ان کے حکم کی تعمیل کی۔ انھیں وہی رکھوا کر اس کمرے کا تالا لگوا دیا۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے انھیں پیرول پر کچھ گھنٹوں کے لئے ہی باہر نکالا گیا ہو۔ بیچاری تختیاں!

ماتمی آواز

راجیشور بابو برآمدے میں جھولا جھول رہے تھے اور گوبند جی اپنے گھر کی دیوار پر ہاتھ رکھ کر کھڑے تھے۔

''پوری کالونی میں ہمارے گھر کی آتش بازی مشہور ہے۔ اس بار بھی میں پندرہ ہزار کے پٹاخے خریدے ہیں۔''

''بھائی صاحب! ان دنوں والد صاحب کی صحت زیادہ نازک ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ ان کا قلب بہت کمزور ہوگیا ہے۔ انھیں مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ میری آپ سے گذارش ہے کہ آپ تیز آواز والے پٹاخے مت چھوڑیئے گا۔''

ان کی بات سن کر انھوں نے جھولے کو پاؤں سے روکا، کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے ''گوبند جی! سال بھر کا تیوہار ہے، بچوں کا بھی من رکھنا پڑے گا! آپ اپنے کھڑکی دروازے بند کر لیجئے گا!''

رات گیارہ بجے راجیشور بابو دوکان میں لکشمی پوجا کر کے اپنے بیٹوں کے ساتھ لوٹے اور پورا کنبہ پٹاخے چھوڑنے لگا۔

جب بڑے بم چھوٹنے لگے تو گوبند جی کی بیوی غصے سے بولیں ''یہ کتنے بے رحم لوگ ہیں! انھیں اپنی خوشی کی پرواہ ہے لیکن اپنے پڑوسی کی ذرا بھی فکر نہیں ہے! پٹاخوں کی آواز سے بابو جی کتنے پریشان ہورہے ہیں!''

تبھی بیٹا کمرے میں داخل ہوا ___ ''پاپا! انکل بہت لمبی لڑی لگا رہے ہیں

......آگے والے مکان کے سامنے سے اسے بچاتے ہوئے وہ اس طرف بھی آ رہے ہیں''۔ بیٹے کی بات سن کر وہ دونوں فکر مند ہو گئے۔

''آپ فوراً جائیے......انھیں منع کیجئے!'' بیوی کی آواز میں گھبراہٹ کے آثار تھے۔

اگر انھوں نے میرا کہنا نہیں مانا اور جھگڑنے لگے تو؟ وہ اسی سوچ میں پڑے تھے کہ 'پھٹ پھٹ ...... پھٹ، کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ مسلسل آتی ان آوازوں سے والد صاحب کی سانسیں تیز چلنے لگیں اور گھبراہٹ سے جسم پسینے میں ڈوب گیا۔ اچانک ان کے سینے میں درد شروع ہوا اور وہ کراہ اٹھے!

گوبند جی ان کے دونوں کانوں پر ہاتھ لگا کر بیٹھ گئے اور بیوی روتے ہوئے ان کے سینے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

جیسے ہی لڑی کی آواز بند ہوئی، اس گھر سے ماتمی آواز گونج اٹھی۔

اپنی اپنی دعا

بیوی عبادت میں منہمک تھی اور بیمار شوہر پلنگ پر لیٹے لیٹے اسے دیکھ رہے تھے۔ بیوی نے سو کر اٹھنے کے بعد کی دعا پڑھی۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ وضو بنایا، سر کو دوپٹے سے ڈھکا، مصلیٰ بچھایا۔ پہلے دو رکعت سنت فجر ادا کی۔ اس کے بعد فجر کی فرض نماز ادا کرنے کے بعد کچھ دیر تک تسبیح و تحلیل میں مصروف رہی۔ قرآن کی تلاوت کیا......! اس کے بعد مصلے پر بیٹھے بیٹھے خدا کی بارگاہ میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔

''خدا! بڑے کی تو تم نے اچھی نوکری لگا دی...... چھوٹے کی اور لگا دو۔ تاکہ وہ بھی آرام سے رہ سکے......اس کے بھی خرچے بڑھ رہے ہیں!''

بیوی کی دعا ختم ہوئی تو شوہر نے پلنگ پر بیٹھے ہوئے کہا۔

''بڑے کی جب تک حالت اچھی نہیں تھی تب تک وہ تمھارے ساتھ رہا۔ جیسے ہی اس کی حالت اچھی ہوئی، گھر سے الگ ہو گیا......اب یہ بچا ہے، اگر یہ بھی خوشحال ہو گیا تو گھر بچوں سے خالی ہو جائے گا......!''

وہ ہاتھ اٹھا کر خدا سے کہنے لگے'' خدا! اس کی بات مت سننا......!''

مجبوری

جب اس نے تھانے دار کو پورا واقعہ بتایا تو وہ حیرت ظاہر کرتے ہوئے بولا ''تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''جی...... میرا پریوار اس کی حرکتوں سے تنگ آ گیا تھا وہ زبردستی میری بہن سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ میرے پاس خودکشی یا اس کا قتل کرنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا''۔

''تو یہاں کیوں چلے آئے؟ جس نیتا کا اسے تحفظ ملا تھا وہاں چلے جاتے۔ تمھیں بھی امان اور تحفظ مل جاتا۔ اور تمھاری غریبی بھی دور ہو جاتی۔''

تھانے دار کی بات سن کر وہ پورے اعتماد سے بولا ''صاحب! میں بھوکے مر جانا پسند کروں گا لیکن غنڈا نہیں بنوں گا۔''

اس نے سپاہیوں کو اسے گرفتار کر لینے کا حکم دیا۔ اسے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

''جس طرح چاہ کر بھی میں اس غنڈے کو سزا نہیں دلوا پایا تھا اسی طرح چاہ کر بھی میں تمھیں باعزت بری نہیں کر پاؤں گا۔ مجھے معاف کرنا بھائی۔'' یہ کہہ کر تھانے دار ضابطے پر عمل کرنے کے لئے جائے حادثے کی طرف چل پڑا۔

نئی رپورٹ

اسکول میں نیتا جی کے دست مبارک سے پرچم کشائی ہوگئی تھی۔ ان کا خطاب چل رہا تھا۔ ''...... ہمیں رام پرساد بسمل، اشفاق اللہ خاں، بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد اور گاندھی جی جیسے محبّ وطن کی تقلید کرنا ہوگا تبھی ملک ترقی کرپائے گا۔

تقریر ختم ہوتے ہی تالیوں سے صحن گونج اٹھا۔ پرنسپل نے ایک استاد کو نیتا جی کی تقریر کا خلاصہ تحریر کرنے کو کہا۔ وہ معلم اپنے ساتھی کو کاغذ دکھاتے ہوئے بولا'' میں نے اخبار میں دینے کے لئے کچا مسودہ تیار کرلیا ہے۔ آپ دیکھ لیجئے۔'' ساتھی کاغذ پڑھ کر بولا۔

''جو نیتا جی نے کہا ہے آپ وہی لکھیں، ورنہ نیتا جی ناراض ہوجائیں گے۔ اور جو امداد حکومت سے اسکول کو مل رہی ہے، وہ بند ہوجائے گی۔''

اب ہمیں اصول و اخلاق کی باتیں نہیں، بلکہ ایسے مثالی کردار چاہئے جن سے عوام سبق لے سکے...... دوہرے کرداروں سے ملک کو بچانا ہوگا۔ تبھی یہ مکمل ترقی کرپائے گا۔ کاغذ پر لکھے یہ الفاظ ٹکڑوں کی شکل میں زمین پر بکھر گئے اور وہ نئی رپورٹ کو بنانے میں لگ گئے۔

آج اور کل

''وقت میں کتنی تبدیلی آگئی ہے کہ ایک چھت کے نیچے رہنے پر بھی آدمی اجنبی سا رہ رہا ہے۔...... آج ہولی ہے اور سبھی اپنے اپنے کمروں میں بند ہیں!''

''اس وقت ہولی پر گھر میں کتنی خوشی چھائی رہتی تھی ...... ایک ماہ قبل سے ہی ہولی کے آنے کا احساس ہو جایا کرتا تھا۔ پر آج ......!'' بیوی کی بات کاٹتے ہوئے بھوشن بابو بولے، بہوئیں تو ڈرائنگ روم کے شوپیش کی طرح ہیں اور بیٹے غلام بن کر ان کے آگے پیچھے گھوم رہے ہیں۔ یہ اس تیوہار کی اہمیت کیا سمجھیں گے؟''

کچھ لمحہ کمرے میں خاموشی چھائی رہی، پھر بھوشن بابو کی آواز سنائی دی ''سنو! 'آج' کا یہ عیش و آرام سے بھرپور عالیشان مکان مجھے 'کل' کے اپنے جھونپڑے کے سامنے بہت چھوٹا لگ رہا ہے۔''

''آپ سچ کہہ رہے ہیں ......!'' یہ کہہ رام دیوی آنچل سے آنسو پونچھنے لگی۔

پرانی ہولی کے کئی مناظر ان کے ذہنی اسکرین پر ابھر رہے تھے۔ جن کے رنگوں سے وہ دونوں شرابور ہوتے جا رہے تھے۔

صبر

''ناصر کے سبھی دوستوں کے پاس اسکوٹر، موٹر سائیکل ہے، میں سوچتا ہوں کہ اپنا اسکوٹر اسے دے دوں''۔

''آپ سٹی بس سے آفس جائیں گے تو کیا اچھا لگے گا؟ چار سال کی تو بات ہے وہ انجینئر بن جائے گا، تو اپنے آپ موٹر سائیکل خرید لے گا!''

'......لیکن مجھے بہت برا لگتا ہے کہ وہ سائیکل سے کالج جاتا ہے، میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ لیا ہے، تم تو جانتی ہو، ناصر کے انجینئرنگ کالج کی اتنی فیس ہے کہ نیا اسکوٹر لینے کی سوچ ہی نہیں سکتا اور مان لو، کوئی پرانا اسکوٹر لے بھی لیا تو اس کی مرمت اور پٹرول کے روپئے کہاں سے آئیں گے؟''

اب بیوی لاجواب ہوگئی۔

یہ روز گھر سے دس بجے نکلتے تھے، لیکن آج انھیں ساڑھے آٹھ بجے نکلنا ہوگا۔ دو جگہ بس بدل کر یہ آفس پہنچیں گے۔ ان کے سبھی دوستوں کے پاس اپنی اپنی موٹر گاڑیاں ہیں اور یہ سٹی بس سے جائیں گے! کیا ناصر انجینئر بننے کے بعد والد کی اس تکلیف کو یاد رکھ پائے گا؟ وہ لنچ باکس تیار کرتے ہوئے اسی فکر میں ڈوبی ہوئی تھی۔

وداع کرتے وقت آج جب شوہر نے اس کا اداس چہرہ دیکھا تو بولے ''تم سوچتی بہت ہو! ارے تم اپنے بھائی کو ہی دیکھ لو...... فیس زیادہ ہونے کے سبب وہ اپنے بیٹے کو انجینئرنگ نہیں کرا سکے...... سنو! ایسے بہت سے لوگوں سے ہم بہت اچھے ہیں!''

شوہر نے ہاتھ میں لنچ باکس پکڑا اور گھر سے باہر نکل گئے۔

ٹوٹن

...... چودہ، پندرہ سالوں میں پوری دنیا ہی بدل گئی۔ دوکانیں بھی شہر کی طرح سجی ہوئی ہیں۔ بس بھی اب دن میں کئی بار چکر لگانے لگی ہے۔ شام کور کشے بھی چلنے لگے۔ اپنی کھلتی بند ہوتی آنکھوں سے وہ چاروں طرف بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ رکشہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا ویسے ویسے وہ اپنی ماضی کی یادوں میں لوٹتا جا رہا تھا۔

''بھیا! ذرا رکشہ روکنا!''

......اسی کھیت میں وہ پونم سے ملا کرتا تھا...... اب تو اس کی شادی بھی ہوگئی ہوگی ...... پورے چودہ برس اور آٹھ ماہ وہ پاکستان میں قیدی بن کر رہا...... بیچاری، کب تک انتظار کرتی۔

اس نے رکشے والے کو چلنے کا اشارہ کیا۔

دوسروں کی طرح گھر والوں نے بھی یہ مان لیا تھا کہ خوشال سنگھ جنگ میں شہید ہوگیا۔ آج اچانک اسے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر چھوٹے بھائی کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔

''ویر جی! خدا کا شکر ہے کہ تمھیں واپس ہمارے پاس بھیج دیا......!''

''دیال اماں کہاں ہیں؟''

''اماں نہیں رہیں ......سات برس ہوگئے۔'' یہ کہہ کر بھائی رو پڑا۔ ......اُف ......اماں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا! یہ خبر سن کر وہ بے جان ہوگیا۔ اس کے ہاتھ کا سامان چھوٹ گیا۔ دیوار کا سہارا لے کر وہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔

کچھ ہی دیر میں پورے قصبے میں شور مچ گیا کہ حولدار خوشال سنگھ لوٹ آیا ہے۔

دن بھر لوگ اس سے ملنے آتے رہے۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد وہ چارپائی پر لیٹ گیا۔ ماضی کے بہت سے حسین واقعات اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے ...... چودہ برس آٹھ ماہ کے قید کی زندگی میں کتنی سختیاں برداشت کیں ...... جہنم کی زندگی گذاری ...... وقت پر روٹی اور پانی سے محروم رہا۔ گالیاں سننے کو ملتی۔ کم بختوں نے مار مار کر ہڈیاں توڑ ڈالیں۔ ایک پیر تو بالکل بے کار ہو گیا۔ چالیس برس کی عمر میں بوڑھا لگنے لگا۔ لیکن ...... لیکن وہ وہاں صرف جسم سے ہی ٹوٹا تھا، من سے نہیں ...... یہاں آ کر من سے بھی ٹوٹ گیا۔ ماں اور پونم ......تم دونوں بھلے ہی میرے گھر سے ......گاؤں سے ...... میری زندگی سے دور ہو گئی ہو لیکن میرے من سے نہیں ......!

جیسے پہاڑی چشمے سے گرتا ہوا پانی کا تار، دریا میں مدغم ہو جاتا ہے ٹھیک اسی طرح اس کی آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسو اس کی ڈاڑھی میں شامل ہوتے جا رہے تھے۔

تذبذب

گھر کے سامنے کار رکنے کی آواز آتے ہی ابو جی چھڑی کے سہارے ڈرائنگ روم کی طرف چل دیئے۔

''بیٹا! سفر میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟''

''نہیں، ابو جی!''

''پروگرام اچھی طرح ختم ہو گیا؟''

''جی ابو! چچا جی آپ کو بہت یاد کر رہے تھے...... میں نے کہہ دیا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اس لئے نہیں آسکے!''

''بیٹا! تمھاری چچی بہت اچھی تھی۔ تمھیں تکلیف تو ہوئی ہوگی۔ لیکن تعزیت میں شامل ہونا بہت ضروری تھا...... ان کا پریوار بھلے ہی دوسرے شہر میں رہ رہا ہو لیکن ہمارا خون تو ایک ہی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

رات کو اختر ان کے کمرے میں آیا۔

''دادا جی! پاپا ناگ پور سے میرے لئے وڈیو گیم لائے ہیں......''

''یہ تو بہت اچھا ہے...... ذرا مجھے بھی دکھاؤ!'' اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دادا جی نے کہا۔

''دادا جی! ممی کہہ رہی تھی کہ چاچا جی کی تعزیت داری چار ہزار میں پڑی...... دادا جی، کیا تعزیت داری اتنی مہنگی ملتی ہے؟''

اختر اپنے سوال کا جواب چاہ رہا تھا اور دادا جی اپنے مستقبل کی زندگی کے متعلق تذبذب میں پتھر کے بت کی طرح بنے ہوئے تھے۔

اسمارٹ

منوہر کے گھر میں داخل ہوتے ہی پاپا نے اس سے پوچھا، ''کیوں بیٹا! اسپیچ اچھی طرح بولی تھی یا کچھ بھول گئے......؟''

''پاپا! گاندھی کی یوم ولادت پر سب سے اچھی اسپیچ میری رہی۔......کسی نے باپو کے بچپن کی، تو کسی نے ان کی سادگی کے واقعات سنائے......ایک میں ہی تھا جس نے باپو کی سچائی اور ایمانداری کے قصے سنائے، جو سر نے مجھے رٹوائے تھے۔'' منوہر نے لڈو کے پیکٹ کو ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

''منوہر کیا تجھے دو پیکٹ ملے......!''

''نہیں پاپا! بھیڑ میں گھس کر میں نے دوبارہ لے آیا تھا!''

منوہر نے بھولے پن سے کہا۔

پاپا نے مسکرا کر پیکٹ کھولا اور لڈو بیوی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولے ''سنو! اب ہمارا منوہر بہت 'اسمارٹ' ہو گیا ہے......!''

اپنی تعریف سن کر منوہر کا چہرہ کھل اٹھا۔

نیم فوجی

وہ نیم فوجی ہوتا ہے، جسے اپنی زندگی میں بہادری کے جوہر دکھانے کا موقع نہیں ملتا۔ جب بھی انھیں یہ جملے یاد آجاتے وہ داخلی طور پر بزدل اور شرمندہ محسوس کرتے۔

آج اپنے کالونی کے دوستوں کے ساتھ وہ باغیچے میں بیٹھ کر اپنے فوج کے دنوں کو یاد کرتے ہوئے بولے" دلی کی زندگی سے میں ابھی تک جڑ نہیں سکا یہاں مجھے قدم قدم پر فوج کے دن یاد آرہے ہیں۔ وہاں آدمی کو ہمیشہ قطار میں دیکھا مگر یہاں دیکھ رہا ہوں کہ قطار توڑنے میں آدمی خوشی محسوس کرتا ہے۔"

"کیپٹن صاحب! کاش ملک کے لئے اپنی جان عزیز کی بازی دینے والے فوجی سے آدمی یہ ہنر سیکھ لیتا تو دیش کی تصویر ہی بدل جاتی۔"

دوست کی بات سن کر اچانک پریڈ گراؤنڈ کے بورڈ پر لکھی وہ سطریں ان کے دماغ میں ابھرنے لگیں۔

افسوس! تیس برس فوج میں رہا۔ روز پریڈ کی۔ اس درمیان جنگ بھی ہوئی لیکن صد افسوس قسمت نے کبھی جوہر دکھانے کا موقع ہی نہیں دیا۔

آج پھر ان جملوں کے ایک ایک لفظ نشتر بن کر ان کے ذہن کو گھائل کرنے لگے۔

بڑے گدھ

برگد کے پیڑ کے نیچے سر جھکا کر بیٹھے ہوئے ان آدیواسیوں کے ناموں کی فہرست ایک رضا کار نے جیسے ہی نیتا جی کے ہاتھ میں رکھی ان کے چہرے پر خوشی کے آثار نمودار ہو گئے۔

ان مرد، عورتوں کے چہرے ان کے مفلسی کی حقیقی تصویر کو ظاہر کر رہے تھے۔ پارٹی کے رضا کاروں نے انھیں گھیر رکھا تھا۔ نیتا جی انھیں مخاطب کر کے کہنے لگے ''آپ کے جسم پر کپڑے ہوں، آپ کو دونوں وقت روٹی ملے، آپ کے پسینے کی ایک ایک بوند کی قیمت کا صحیح اندازہ لگایا جائے۔ یہی میرا خواب اور خواہش ہے۔ اپنے اسی خواب کو پورا کرنے کے لئے میں اس مرتبہ پھر چناؤ میں کھڑا ہوا ہوں۔ میں آپ کا خادم ہوں ...... آپ خوب کھائیں، پیئں، میں نے سبھی انتظام کر دیئے ہیں۔ کل چناؤ ہے۔ آپ مجھے اپنی جھونپڑی میں بیٹھے بیٹھے دعائیں دے دیں۔ آپ کا ووٹ مجھے مل جائے گا!''

''سب لوگ تالی بجاؤ!'' رضا کار نے ان آدیواسیوں کو حکم دیا۔

اچانک 'سر......سر......' کی آواز سے برگد کے پتے ہل اٹھے۔

سبھی نے دیکھا ایک گدھ گھبرایا ہوا باہر نکلا اور اس نے تیزی سے اڑان بھر لی۔

بوائے فرینڈ

''کیا نیند نہیں آ رہی؟''

''جب جوان بیٹی باپ کو دنیاوی تعلیم دینے لگے تو باپ کو کیسے نیند آ سکتی ہے؟ میں نے اپنی زندگی میں بہت سی چیزوں کی تنگی کا دکھ اٹھایا۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ بیٹی بھی تنگی میں زندگی گزارے۔ اس لئے میں نے اس کی ہر خواہش پوری کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور اس نے میری اس کمزوری کا فائدہ اٹھایا۔ تم سچ کہتی ہو۔ میرے لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا۔'' وہ دکھی ہوا ٹھے۔

''اب لگ رہا تھا کہ پرسکون زندگی گزرے گی۔ تو یہ پریشانی آ کر کھڑی ہو گئی۔ بٹیا پر زور زبردستی بھی نہیں کر سکتے۔ روز اخبار میں پڑھنے کو ملتا ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر بچوں نے خودکشی کر لی!''

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کر لی۔

'پاپا! آج اگر لڑکے، لڑکیاں اکیلے گھومتے ہیں تو انھیں بیک ورڈ سمجھا جاتا ہے۔ وہ سب باتیں معمولی ہو گئی ہیں، جو آپ کے زمانے میں خاص اور اہم مانی جاتی تھیں۔ نہ جانے کون سی صدی میں آپ لوگ جی رہے ہیں!' بیٹی کے یہ الفاظ ابھی بھی ان کے دل میں نشتر کی طرح پیوست ہوتے جا رہے تھے۔

'بوائے فرینڈ' نے اچانک ان کے گھر میں داخل ہو کر ان کی نیند اڑا دی۔

خوف

سیٹھ جی کے گھر رات کو چوری ہوگئی۔

پورا کنبہ ایک رشتے دار کے یہاں شادی میں گیا تھا۔ ان کے لوٹتے ہی گھر میں ماتم مچ گیا۔ چھ لاکھ کے زیورات اور تقریباً دو، ڈھائی لاکھ روپے چور لے گئے۔

جیسے ہی سیٹھ جی کو معلوم ہوا کہ بڑا بیٹا تھانے میں رپورٹ لکھوانے جا رہا ہے وہ اسے ڈانٹتے ہوئے بولے، دیکھ دامو! تھارے بات سمجھ میں نہیں آ ئیری ہے۔...... اپن تو سب دکان چلیا جاواں گا، نے ٹیم بے ٹیم پولس گھر آ یئے کے لوگا یاہون کے تنگ کرے گی۔ جو گیو ہے، او تو ملے کونیں، نے پھیر انکم ٹیکس والا اون کو چکر...... ان لوگاں کے تو روپیوں چیئے بس۔''

میں کتنی بڑی غلطی کرنے جا رہا تھا! بیٹا گھر کے اندر لوٹنے لگا 'ہائے لٹی گیو رے' کا راگ الاپتے ہوئے وہ اس کے پیچھے، پیچھے چل دیئے۔

جرم

حِنا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر میک اپ میں لگی تھی اور وہیں سمیر خاموش بیٹھا تھا۔ سبھی کے والدین اپنے بچوں سے ملنے ہوسٹل میں ہر ہفتے جاتے ہیں اور ہمیں پندرہ دن ہو گئے اس سے ملے۔ میں نے کتنا کہا کہ آج انس سے ملنے چلتے ہیں، یہ سن کر وہ کہنے لگی کہ آج اسے ایک خواتین کلب نے جرم پر اظہار خیال کرنے کے لئے مدعو کیا ہے۔ کیا اسے یہ نہیں معلوم کہ اپنوں کا دل دکھانا یا ان کے دل کو لہولہان کرنا بھی تو جرم ہے۔

''سمیر! تم اکیلے ہی انس سے مل آنا۔ ویسے وہ تمھیں ہی زیادہ پیار کرتا ہے۔ اگر میں وہاں نہیں گئی، تو میری سہیلیوں کا دل ٹوٹ جائے گا'' حنا نے آدم قد آئینے میں اپنا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا اور باہر نکل گئی۔

سمیر اس کی بات سن کر تلملا اٹھا۔ پہلی بار تازہ کھلے پھول سی لگنے والی حِنا آج اسے کاغذ کے پھول سی بے جان خوشبو لگنے لگی۔

ریزہ ریزہ تصور

امین جی کو دیہی علاقے کے اس اسکول میں تبادلہ ہوئے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا۔ درمیانی وقفے میں سبھی اساتذہ 'اسٹاف روم' میں جمع ہو کر چائے نوشی کیا کرتے تھے۔ آج جب سبھی اساتذہ آ گئے تو امین جی بولے، ''میں بہت دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ انتر سنگھ جی کا کپ ہم سب سے الگ رہتا ہے...... مجھے یہ مناسب نہیں لگتا۔''

یہ سن کر کچھ اساتذہ ان سے بحث کرنے لگے۔ بات کو سنگین ہوتے دیکھ کر انتر سنگھ جی بولے'' امین جی! آپ میری مدافعت کہاں کہاں کریں گے؟ میں استاد ہوں، لیکن کنویں پر مجھے دور سے پانی دیا جاتا ہے! آپ ہی بتایئے آپ لوگوں کی طرح اونچے خاندان میں میرا جنم نہیں ہوا تو اس میں میرا قصور کیا ہے......؟ ان کی آواز بھاری ہو گئی۔

اتنے میں چپراسی چائے کی کیتلی لے کر آ گیا اور ٹیبل پر کپ جمانے لگا۔ انتر سنگھ جی الماری میں رکھا اپنا کپ اٹھانے کے لئے کھڑے ہوئے۔

گھبراہٹ میں ان کے ہاتھ سے کپ چھوٹ گیا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ کمرے میں ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی۔

زیادہ تر چہروں پر طنز آمیز مسکراہٹ دیکھ کر امین جی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ زمین پر پڑے کپ کے ٹکڑوں کو دیکھنے لگے۔ انھیں لگ رہا تھا کہ شہیدوں کے ذریعے آزاد ہندوستان کا کیا گیا تصور گویا ریزہ ریزہ ہو گیا ہو!

اس پر...... اتنے روپئے لگا دیئے پر کوئی فائدہ نہیں ہوا! یہ بوڑھا بھی ہو گیا ہے اور اب ہمارے کسی کام کا نہیں رہا......!''

کچھ لمحے خاموشی رہی، پھر شوہر کی آواز سنائی دی۔

''ایک طریقہ ہے!''

''کیا......؟'' بیوی نے تعجب ظاہر کیا۔

''ہم اسے بقر خانے چھوڑ آتے ہیں......!''

''ہاں ٹھیک رہے گا۔'' بیوی نے اتفاق رائے ظاہر کیا۔

''اس بیل نے ہماری اتنی خدمت کی ہے۔ اس لئے میں اسے بقر خانے میں نہیں چھوڑوں گا......! بیٹا ناراض ہوتے ہوئے بولا۔

بیٹے کی بات سن کر انھیں اپنی بھول کا احساس ہونے کے ساتھ ساتھ اطمینان بھی ہوا انھیں لگا جیسے بیٹے نے ان کے بوڑھاپے کا بیما کر دیا ہو۔

آخری گفتگو

''ابو جی! آپ کھانا کھایئے اور خاموش بیٹھئے، آپ آئے دن کوئی نہ کوئی ٹینشن کیوں کھڑی کرتے رہتے ہیں؟'' بیٹا غصے میں باپ سے بولا۔ رات کو بیوی نے اسے ایسی پٹی پڑھادی تھی کہ باپ کے سامنے آتے ہی وہ پھٹ پڑا۔ اس کی بات سن کر بدحواس ہو گئے۔

''بیٹا! اگر کنبے کا کوئی ممبر میری آنکھوں کے سامنے غلط کرے گا تو مجھے منع ہی کرنا پڑے گا...... اس میں ٹینشن والی کیا بات ہے؟ جب سے تم نے دھوکے سے مکان کے کاغذات پر میرے دستخط کرالئے، تبھی سے تمھارا رخ بدل گیا...... تم تو مجھے ضعیف خانے یا ہری دوار چھوڑ آؤ......! میں جیسے تیسے اپنی زندگی گذار لوں گا!''

''میں تو آپ کو کب کا چھوڑ آتا، لیکن سماج کیا کہے گا......؟ اسی خوف سے اب تک خاموش بیٹھا ہوں۔''

''باپ کی فکر نہیں اور سماج کا اتنا خیال! بیٹا! اگر تمھاری طرح اولاد ہونے لگیں گی تو مستقبل میں لوگ اولاد پیدا کرنا ہی بند کردیں گے......!''

انھیں دل میں درد اٹھا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھے، زمین پر گر پڑے۔ وہ ان کی زندگی کی آخری گفتگو بن گئی۔

کتّا

میں نے کبھی کسی سے ایک روپئے کی چاہت نہیں رکھی اور ایک یہ آفسر ہے جو رشوت مانگ رہا ہے، وہ بھی اس رقم پر جو میں نے اپنی تنخواہ سے کٹا۔ کٹا کر مستقبل کے لئے جمع کیا تھا، وہ کمرے کے باہر بیٹھے اس آفیسر کو کوس رہے تھے۔

''جائیے، صاحب بلا رہے ہیں!'' چپراسی کی آواز سن کر وہ کمرے کے اندر جانے لگے۔

''سر! مجھے ریٹائر ہوئے دو ماہ ہو گئے ہیں لیکن (PF) مستقبل کھاتے کی رقم مجھے ابھی تک نہیں ملی۔ اگلے ماہ میری بیٹی کی شادی ہے۔ میرے سبھی کام رکے ہوئے ہیں۔ سر، اس سے زیادہ کی مجھ میں طاقت نہیں ہے!'' اپنی بات مکمل کر کے انھوں نے لفافے کو ٹیبل پر رکھ دیا۔

''آپ جائیے......شام کو گھر سے چیک لے لیجئے گا!''

آفیسر نے جلدی سے لفافے کو جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

شام کو بنسی دھر جی آفیسر کے گھر پہنچے، گیٹ کھول کر وہ اندر داخل ہوئے۔ صاحب کرسی پر بیٹھے بریڈ کا ٹکڑا اچھال رہے تھے اور ان کا فارینیر کتا اسے لپک کر جھپٹ رہا تھا۔

''اس نے بھی، تو اسی طرح لفافہ جھپٹ لیا تھا......!''

وہ آفیسر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

دوکان داری

جب دوسرے دن بھی فساد بند نہیں ہوا تو حکام اور پولیس آفسر فکر مند ہو گئے۔ سبھی نے میٹنگ کی اور ایک فیصلے پر سب کی رضامندی کی مہر لگ گئی۔

کلکٹر آفس کی چھت دو گروپوں میں منقسم تھی۔ سبھی آفیسر وہاں موجود تھے۔ ایک گروپ سے آواز آئی" جب اسی زمین پر دونوں فرقوں کو رہنا ہے تو پھر یہ فساد کیوں؟"

اسی طرح دوسری پارٹی کے لوگوں نے دلیل دی۔" آپسی بھائی چارے کی سوچ ہمارے ملک میں ہمیشہ سے رہتی آئی ہے، اسے بنائے رکھنا ہم سیاست داں کی ذمہ داری ہے۔"

وہاں دونوں پارٹی کے نیتاؤں نے عوام کے نام کئی پیغام جاری کئے۔

'امن میٹنگ' ختم ہوتے ہی سبھی نامہ نگار زینے سے نیچے اترنے لگے۔ نیچے آ کر ایک نامہ نگار کا دھیان چھت کی طرف چلا گیا۔ وہاں دونوں پارٹی کے لوگ آپس میں گلے مل رہے تھے۔ اپنے ساتھی کی توجہ اس طرف کرتے ہوئے بولا" اگر یہ پہلے ہی گلے مل لئے ہوتے تو شہر کی اتنی حالت خراب نہیں ہوتی"۔

دوسرے نے جھلا کر اسے جواب دیا" انھیں شہر کی فکر نہیں...... انھیں تو اپنی۔اپنی دوکان داری چلانی ہے...... چناؤ جو قریب آرہے ہیں۔"

کمائی

''اب چین سے سویا ہے...... تین گھنٹے کتنا تڑپا، میرا تو دل ہی بیٹھا جارہا تھا۔ کبھی سوچا کہ ہمیں کتنا پاپ ملے گا۔ کتنا سمجھایا، لیکن تم نہیں رکے...... تم نے غصے میں آ کر مجھے دھکا دے دیا...... اگر میری ٹانگ ٹوٹ جاتی تو......'' گود میں لیٹے بچے کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بولی۔

اس کی بات سن کر شراب کے نشے سے جھپکتی شوہر کی آنکھیں اس کے چہرے پر ٹک گئیں۔

''لنگڑی ہو جاتی تو بھیک میں چار پیسے زیادہ ملتے...... سالی۔ پڑھے لکھوں کی طرح ثواب اور گناہ کی بات کر رہی ہے۔ سن مورکھ، یہ سب امیروں کے لئے ہوتے ہیں۔ غریب کے لئے نہیں۔ جس جھونپڑی میں ہم رہ رہے ہیں وہ کیا کسی جہنم سے کم ہے ...... مرنے کے بعد ہمیں کون سی جنت ملنا ہے!'' سمجھاتے ہوئے اس نے جیب سے بیڑی نکالی اور سلگانے لگا۔

''تم بہت ظالم ہو......!'' بڑا والا تمھارے مار کے ڈر سے گھر سے بھاگ گیا۔ اس سے بھی تم بھیک منگوانا چاہتے تھے...... بے چارہ نہ جانے کہاں ہوگا؟'' کہتے ہوئے وہ رو پڑی۔

''بھکاری کی اولاد ہے...... سالا کہیں بھیک مانگ رہا ہوگا۔ خنزیر کا جنا گندگی میں ہی لوٹے گا''۔ نشے کے سبب وہ بیڑی کا گل گرانا بھول گیا اور وہ اس کے ہاتھ پر گر پڑا۔ اپنا ہاتھ جھٹک کر وہ جھلا اٹھا۔

''اس سے تو اچھا تھا ہم مزدوری کرتے، ایسے خراب دن تو نہیں دیکھنے پڑتے۔ پر تم تو کام چور تھے...... نہ مجھے مزدوری کرنے دی اور نہ خود کی۔ دیکھو...... دیکھو اس کی آنکھوں سے خون بہہ رہا ہے...... ارے، تو آدمی نہیں، جانور ہے...... تجھے موت آئے ......تو برباد ہو جائے۔'' اس کے اندر کی ماں نے اب اس پر پورا قبضہ کر لیا تھا۔ خون دیکھ وہ آپے سے باہر ہو گئی تھی۔

اس کی بات کو نظر انداز کر کے وہ بولا، ''کھیڑا داس سہی کہہ رہا تھا تل چٹے نے اپنا اثر دکھا دیا۔ اس نے کہا تھا کہ پہلے بچہ تڑپے گا، جب تل چٹا مر جائے گا تب بچے کی تڑپ بند ہو جائے گی اور کچھ دیر بعد اس کی آنکھوں سے خون بہنا شروع ہو جائے گا۔''

لمحے بھر بعد رک کر بیوی کی طرف دیکھتا ہوا بولا، حرام خور...... تیرے اور اپنے بوڑھاپے کا انتظام کر رہا ہوں اور تو مجھے کوس رہی ہے۔

سن...... ابھی یہ آٹھ ماہ کا ہے۔ دو سال کی تو بات ہے پھر تو یہ خوب کمائی کرنے لگے گا......!''

اپنی بات پوری کر وہ پھر سے بیڑی سلگانے لگا لیکن ماں کی آنکھوں کے سامنے بیٹے کی آنکھوں سے بھی زیادہ اندھیرا تھا۔

اخلاقی قدریں

''دفتر سے لوٹ رہا تھا تو سمیر مل گیا۔ کہہ رہا تھا کہ آج ہی مہاراشٹر سے لڑکی دیکھ کر لوٹا ہے! اگلے مہینے شادی ہے۔'' گھر میں داخل ہوتے ہوئے سوم بابو بولے۔

''..........تو کیا وہ رانی سے شادی نہیں کر رہا ہے؟'' بیوی نے تعجب ظاہر کیا۔

''میں نے جب اس کے بارے میں دریافت کیا تو وہ بولا -- انکل، رانی میری دوست ہے... اس سے زیادہ کچھ نہیں! ہم دونوں نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ شادی گھر والوں کی مرضی سے کریں گے۔''

''... تو کیا گھر والوں کی مرضی سے ہاتھ میں ہاتھ رکھ کر سڑکوں پر گھوما کرتے تھے؟ کیسا برا وقت آ گیا۔ لڑکے لڑکیوں نے تو اخلاقی قدروں کو طاق پر رکھ دیا ہے..... نہ لاج ہے نہ شرم....!'' بیوی اس کے لئے ٹی۔ وی۔ اور فلموں کو ذمہ دار ٹھہرانے لگی۔

فوراً شوہر کے دماغ میں کالج میں پڑھ رہی اپنی بیٹی کی شکل ابھر آئی اور وہ بے چین ہو اٹھے۔

ناگ

وہ دوست کی بات کا ہاں-ہوں، میں جواب دیتا ہوا سوچ میں ڈوبا چلا جارہا تھا۔

"وہاں کا کلرک میرا ملنے والا ہے، اس نے مجھے بتایا کہ تمہارا نام سیلیکشن کمیٹی میں سب سے اوپر رکھا تھا۔ بس آرڈر پر آفیسر کے دستخط ہونے باقی تھے،۔ تبھی اس کے لئے بانکے بہار جی کا فون آ گیا اور اسے نوکری مل گئی...! یار، ہم لوگوں کے پاس کسی نیتا کی سفارش نہیں ہے، اس لئے در در کی ٹھوکریں کھانی پڑ رہی ہیں!" دوست اسے تسلی دیتا ہوا بولا۔

فٹ پاتھ پر بھیڑ کو کھڑا دیکھ کر وہ رک گئے۔ کچھ لوگ لاٹھی اور ٹھوکر سے سانپ کو مارنے میں لگے تھے۔ جب وہ نیم جان ہو گیا تو انھوں نے اسے دیوار پر ٹانگ دیا۔

دیوار پر ایک پوسٹر لگا تھا، جس میں بانکے بہاری جی! عوام سے انھیں ووٹ دینے کے لئے ہاتھ جوڑ کر اپیل کر رہے تھے۔ سانپ کا آدھا حصہ اس پوسٹر پر تھا اور آدھا دیوار کی دوسری جانب۔

"یہ بھی کسی ناگ سے کم نہیں ہے۔ پہلے عوام کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں، پھر اسے ڈستے ہیں۔ دیکھنا، ایک دن انھیں بھی اسی طرح کچلا جائے گا"۔

اس پوسٹر کو دیکھ کر اچانک اس کے منہ سے نکل پڑا۔

تربیت

بیٹا کالج کا طالب علم بنتے ہی بدلتے زمانے کی ہوا سے متاثر ہونے لگا۔ وہ اکثر باپ کو ایسی بات کہہ دیتا کہ وہ تلملا اٹھتے۔

آج جب وہ دونوں اس دوکان سے باہر نکل رہے تھے تو بیٹا بولا، ''پاپا!'' اگر میں آپ کے عہدے پر ہوتا تو خوب دولت کماتا---!'' اس کی بات سن کر وہ سمجھ گئے کہ انھوں نے اسے قیمتی لباس نہیں دلائے، اس لئے ایسا کہہ رہا ہے۔

کچھ دور چل کر وہ رکے اور فٹ پاتھ پر لگی اس دوکان کی طرف اشارہ کر کے بولے، ''بیٹا! وہ سامنے تالے کی دوکان پر جو لڑکا بیٹھا ہے، میں اسے جانتا ہوں--- باپ کے اچانک انتقال کر جانے کے سبب اسے اسکول کی پڑھائی چھوڑ کر دوکان پر بیٹھنا پڑا ---! وہ کسی بھی تجوری کا تالا توڑ کر راتوں رات دولت کمانے کی کوشش بھی کر سکتا ہے، لیکن وہ ایسا کچھ نہیں کر رہا- وہ ایمانداری سے زندگی گزار رہا ہے اور تم اتنے پڑھے لکھے ہو کر بے ایمانی کرنے کی بات سوچتے ہو؟''

''پاپا ! مجھے معاف کر دیجئے---!''

بیٹے کی بات سن کر وہ من ہی من تسلی محسوس کرنے لگے۔

وداعی

اسٹیج پر شرما جی کے قریب ان کے معاون آفیسر سمیر جی بیٹھے تھے۔اس کے بعد کمیشنر آفس سے آئے، بڑے صاحب کی کرسی تھی جن کی صدارت میں شرما جی کی ریٹائرمنٹ کے موقع پر یہ پروگرام منعقد کیا گیا تھا۔

جیسے ہی ناظم جلسہ نے شرما جی کو اظہارِ خیال کے لئے مدعو کیا، وہ اٹھے اور مائک کی طرف جانے لگے۔

سمیر جی صاحب کے کان میں کہہ رہے تھے-- ''سر! دو سال سے شرما جی کنڈلی مار کر ایسے بیٹھے تھے کہ کچھ بھی کمائی نہ ہو سکی----!''

''اب تو آپ ہی کا راج رہے گا- چھ ماہ تک میں کسی کا تبادلہ نہیں کروں گا۔آپ ہی انچارج رہیں گے- سمیر جی! میں نے بیٹی کو ڈونیشن دے کر میڈیکل کالج میں اور بیٹے کا انجینئیر نگ کالج میں داخلہ دلایا ہے- میرے بھی خرچ بڑھتے جا رہے ہیں !''

سر! آپ مطمئن رہیے... دکھ بھرے دن اب ختم ہو چکے ہیں۔'' وہ صاحب کو امید بندھانے لگے۔بے چارے شرما جی! وہ مائک پر کچھ ہی دیر بول پائے-ان کا گلا رندھ گیا-رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے وہ اپنی کرسی کی طرف..... لوٹنے لگے۔

بوجھ

''کل منھی.... کام کی نہ کاج کی، ڈھائی من اناج کی...! جا، جا کر رامو کو چپ کرا...!'' چلم میں تنبا کو بھرتے ہوئے باپ دہاڑا۔

گوری سہمی ہوئی رامو کو گود میں لے کر دروازے پر جا کر کھڑی ہوگئی۔

شوہر کے یہ جملے سن کر چولہا سلگا رہی پھولوا کے دماغ میں کئی دھوندھلے منظر ابھرنے لگے..... بچپن میں وہ بھی گوری کی طرح کویں سے پانی لایا کرتی، کھیت میں کام بھی کرتی اور گھر میں ماں کے ساتھ کاموں میں ہاتھ بٹایا کرتی۔ پھر بھی باپ اسے گھر کا بوجھ مانتے اوراس کے بھائیوں کو پیار کرتے۔ اس نے آنچل سے آنسو صاف کر لئے۔

اس نے دیکھا شوہر آنکھیں بند کئے چلم پینے میں لگا تھا اور گوری رامو کی پیٹھ تھپتھپا کر اسے سلا رہی تھی۔

بے چاری! وقت نے اسے چھوٹی سی عمر میں آدھی ماں بنا دیا۔ لعنت ہے ایسے مردوں پر، جو لڑکی سے جانوروں کی طرح کام کرواتے ہیں اور اسے گھر کا ''بوجھ'' سمجھتے ہیں---! یہ سوچتے ہوئے اس نے توے پر روٹی ڈالی اور گوری کو دیکھنے لگی۔

---اپنے بچپن کے وہ دھوندھلے ہوئے منظر اس کے دماغ میں پھر گردش کرنے لگے۔

غم زدہ

''کولکاتا میں آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟''

اپنے دوست کی بات سن کر وہ فکر میں پڑ گئے۔

''یار! یہاں اچھا نہیں لگ رہا ہے!''

''بچوں کے کیریر کو بنانے کے لئے لوگ روپیہ دے کر یہاں تبادلہ کراتے ہیں۔ تم بغیر خرچ کئے یہاں آ گئے، اس لئے ایسا کہہ رہے ہو!''

''تمھارا کہنا سچ ہے، یہاں بچوں کا کیریر تو بن جائے گا، لیکن یہاں کے ماحول میں رہ کر وہ اچھے انسان بنیں گے اس میں مجھے شبہ ہے!''

''شبہ کیوں؟''

''جنگل میں جب بڑے جانوروں کا پیٹ کھالی ہوتا ہے، تبھی وہ چھوٹے جانوروں کو کھاتے ہیں، لیکن یہاں کا آدمی تو شکم سیر ہونے پر بھی چھوٹے آدمی کو کھا جاتا ہے۔ بہت بے حس اور مردہ دل ہیں یہاں کے لوگ.....! یہ سوچ کر میں پریشان ہو جاتا ہوں، اگر بچے بھی اسی ماحول میں رنگ گئے تو.....!''

دوست حیرت زدہ تھا اور وہ غم زدہ۔

ذات

رضا کاروں سے جب انھیں معلوم ہوا کہ مالی محلّہ، کھٹیک پورہ، لودھی گنج، ہریجن کالونی، سندھی محلّہ، برہمن پاڑا اور حسین خان کی بزریا کے نیتاؤں سے سیٹنگ ہوگئی، تو وہ بولے، ''یہ تو اچھا ہے کہ ووٹر، رائے دہندگاں الگ الگ ذات میں منقسم ہیں ورنہ بہت پریشانی ہو جاتی۔''

''بھائی صاحب! آپ کی ذات کے پچاس ہزار ووٹر ہیں اگر انھوں نے ساتھ دے دیا تو ہمیں کوئی بھی شکست نہیں دے سکتا۔''

اس رضا کار کی بات سن کر وہ بولے، ''وہ تو مجھے ملنا ہی ہے ......اسی بنیاد پر تو پارٹی نے مجھے ٹکٹ دیا ہے۔''

ووٹنگ ہونا باقی تھا، لیکن ان کا چہرہ فتح کی یقینی سے چمک رہا تھا۔

آوٹ آف ڈیٹ

''ماں! میں انجینئرنگ کرلوں، پھر دیکھنا میں گھر کی حالت بدل دوں گا...... میں پاپا کی طرح نوکری نہیں کروں گا!''

دانش کی بات سن کر سبزی کاٹتی ہوئی ماں کے ہاتھ رک گئے۔ وہ ایک ٹک بیٹے کو دیکھنے لگی۔

''ماں! میں نے دیکھ لیا ہے کہ ایمانداری سے چلنے پر گھر والوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے اور شعبے میں بھی توہین ہوتی ہے۔ جیسی ہمیشہ پاپا کی ہوتی رہی...... پاپا کے ساتھ آفیسروں کے بچوں نے میرے معمولی سادہ رہن سہن پر بہت طعنے دیئے ہیں...... ماں! میں انھیں بتادوں گا کہ میں ان سے کسی طرح کم نہیں ہوں!''

''......لیکن بیٹا، آدمی کو سچائی اور ایمانداری کے راستے پر چلنا چاہئے، تبھی اس کی زندگی کامیاب مانی جاتی ہے!''

''ماں! میں نے یہ بڑی بڑی باتیں کتابوں میں پڑھی ہیں۔ مگر آج کی دنیا اس کے الٹی چل رہی ہے...... دنیاداری میں اب یہ چیزیں ''آوٹ آف ڈیٹ'' ہوگئی ہیں۔''

اس کی بات سن کر ماں کی انگلی چاقو کی دھار سے ٹکرا گئی اور وہ کراہ اٹھی۔

بے چاری اردو

جنید بابو گاؤں سے آئے اپنے بھتیجے راشد کو دلی گھمانے کے لئے نکلے تھے۔ سڑک پر ریلی نکلنے کے سبب آمدورفت رک گیا تھا۔ وہ بھی فٹ پاتھ پر کھڑے ہوکر ریلی کو دیکھنے لگے۔

ریلی میں چل رہے لوگ ہاتھوں میں تختیاں لئے ہوئے تھے۔ جن پر لکھا تھا: فرد، فرد کی زبان اردو ہے، وزیر، آفیسر کی زبان اردو ہے، دادا، دادی کی زبان اردو ہے۔

اسی تسلسل میں کسانوں، مزدوروں، وزیر اعظم، وزیر اعلیٰ، کورٹ وغیرہ کی زبان اردو ہے، کے نعرے بھی لگائے جا رہے تھے۔

"چچا جی! اگر ان سبھی کی زبان اردو ہے تو پھر اس ریلی کی کیا ضرورت ہے ......؟

"بیٹا! ہمارے من میں کچھ ہے اور منہ میں کچھ اور ......! ہم مادری زبان سے محبت کا صرف نمائش کرنا چاہتے ہیں، اسے دل سے اپنانا نہیں چاہتے۔"

چچا جی کا جواب سن کر راشد کو لگا جیسے ریلی چلتے چلتے اچانک غیر مرئی عنصر ہوگئی ہو۔

دور اندیش

مذاکرہ ختم ہونے کے بعد جب وجے نے صدارتی کرسی پر بیٹھے رمیش جی کو آداب کہا تو وہ اپنا کارڈ دیتے ہوئے بولے،''میں نے تمھارے طرزِ تقریر سے معلوم کرلیا ہے کہ تمھارے ذہن و دل میں وطن کی محبت کا گہرا جذبہ ہے۔ میں تمھارے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ تمھارے جیسے نوجوانوں کی آج ملک کو ضرورت ہے۔ جب بھی تمھیں کوئی تکلیف ہو، تم بلا جھجک میرے پاس آسکتے ہو......!''

دو دن بعد جب وجے ان کے آفس پہنچا تو اسے دیکھتے ہی انھوں نے رضا کاروں کو باہر والے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا۔ وجے کو اپنے پاس بیٹھاتے ہوئے وہ بولے''تم کیا کرتے ہو؟''

''سر میں ایم.کام. فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوں، سال بھر سے ایک اچھی سی نوکری کی تلاش میں ہوں ...... اگر آپ مجھے نوکری دے دیں گے تو مجھ پر ہی نہیں، میرے پورے کنبے پر آپ کا احسان ہوگا......! میرے والد سرکاری دفتر میں کلرک ہیں، ان کے کندھوں پر بہن کی شادی کا بوجھ ہے، میں چاہتا ہوں کہ میں اس بوجھ کو ہلکا کرسکوں!'' یہ کہتے ہوئے وجے کی آواز بھاری ہوگئی۔

''وجے! اب نوکری میں کوئی دم نہیں رہا...... تمھارے جیسے جوشیلے لوگوں کی آج ملک کو سخت ضرورت ہے...... اگر تم چاہو تو میں تمھیں سیاست کے میدان میں بہت اونچائی پر بیٹھا سکتا ہوں......!''

''......لیکن سر، مجھے سیاست کی اے. بی. سی. ڈی بھی نہیں آتی۔''

''بیٹا! سیاست کرنے کے لئے کسی ڈگری کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تم کچھ دن میرے ساتھ رہو۔ سب سیکھ جاؤ گے۔ ہاں ایک بات دھیان سے سن لو۔ آج کی سیاست پہلے جیسی نہیں رہی، اس لئے مجھے بھی وقت کے حساب سے چلنا پڑ رہا ہے۔...... تمھیں میرے کاموں کی رازداری کا پاس ولحاظ رکھنا ہوگا۔''

''سر! آپ بے فکر رہئے۔''

''وجے! خالی پیٹ رہ کر سیاست نہیں کی جاسکتی۔ یہ اپنے پاس رکھ لو۔'' سو روپئے کی ایک گڈی دیتے ہوئے انھوں نے کہا۔ وجے انھیں آداب کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

وجے کے باہر نکلتے ہی رضا کار اندر آ گئے۔ رمیش جی ان سے کہنے لگے، ''اس لڑکے کو میں نے اپنے گروپ میں شامل کرلیا ہے۔ یہ بہت دانش ور ہے۔ ایک سال بعد چناؤ ہے۔ یہ میری تقریر لکھے گا۔ میرے جلسے کو خطاب کرے گا۔ اگر ایسے دس لڑکے مل جائیں تو میں گھر بیٹھے انتخاب جیت سکتا ہوں۔''

''بھائی صاحب، میں آپ کی دور اندیشی کی داد دیتا ہوں۔'' ایک بوڑھے تجربہ کار رضا کار نے خوش ہو کر کہا۔

اور قول کی تائید میں ان کے سر ہل اٹھے۔

محبّ ہندی

چھٹی پر جانے سے قبل پرساد بابو کا پرسنل سکریٹری انھیں آج کے پروگرام کی اسپیچ لکھ کر دے گیا تھا۔ مگر کافی جستجو کے باوجود بھی وہ کاغذ انھیں نہیں مل رہا تھا۔ اسی وجہ سے وہ فکرمند ہو کر کمرے میں ٹہل رہے تھے۔

''صاحب! جلسے کا وقت ہو گیا......!''

''ٹھیک ہے...... میں آرہا ہوں!'' انھوں نے ڈرائیور کو جواب دیا اور پھر اس کاغذ کو ڈھونڈھنے لگے۔

بیوی ان کی بے چینی سمجھ گئی وہ انھیں سمجھانے لگی۔ ''جس طرح آپ اپوزیشن پارٹی کو کوس کر اپنا اُلو سیدھا کرتے ہیں، ٹھیک اسی طرح آج آپ انگریزی کو خوب کوسیئے گا......! آپ جتنا زیادہ انگریزی کو کوسیں گے اتنے ہی بڑے ہندی کے چاہنے والے مانے جائیں گے۔

پرساد بابو کے چہرے پر چھایا ہوا تناؤ اب جا چکا تھا وہ بیوی کو ''لاٹ آف تھینکس'' کہتے ہوئے 'یوم ہندی' کے پروگرام میں شرکت کرنے گھر سے نکل پڑے۔

مقصد

آج وہ بہت خوش تھے۔ دفتر سے آتے ہی انھوں نے بیوی سے موہن کے پیپر کے متعلق دریافت کیا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ اس کا پیپر بہت اچھا ہوا ہے تو وہ بیوی سے بولے، ''تم نے اور میں نے بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں ......اب ان سب تکلیفوں سے چھٹکارا مل جائے گا۔......آج میں بہت خوش ہوں...... مجھے لگ رہا ہے کہ میرا مقصد پورا ہو گیا۔''

دونوں باتیں کر رہے تھے، تبھی موہن آیا اور انھیں سلام کرتے ہوئے بولا، '' ابو جی! اب میں انجینئر بن گیا ہوں۔''

دعا دیتے ہوئے وہ بولے'' بیٹا! اب نوکری کرنے کا ارادہ ہے یا آگے پڑھنے کا،تم نے کیا سوچا ہے؟''

''ابو جی! میں نے غیر مما لک جانے کا فیصلہ کیا ہے۔

'' کیوں بیٹا! ......تم تو ٹاپر ہو، تمھیں تو یہیں اچھی نوکری مل جائے گی۔ تم ہمارے اکلوتے بیٹے ہو، اگر تم ملک سے باہر چلے جاؤ گے تو گھر میں ہم دونوں ہی بچیں گے!''

''ابو جی! میں یہاں نوکری نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے آپ کی محتاجوں والی زندگی بہت قریب سے دیکھی ہے، میں اب ایسی زندگی جینا نہیں چاہتا!'' اپنی بات پوری کر کے موہن کمرے سے نکل گیا۔

بیوی ان سے بولی۔'' ہم لوگوں نے اسے کتنے پاکیزہ گھریلو ماحول دیئے لیکن آج یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے......!''

بیوی جب موہن کو غلط ماننے لگی تو وہ بولے۔ ’’غلطی موہن کی نہیں، غلط آج کا ماحول ہے۔ جس کے سبب نوجوان عیش و آرام کو ہی زندگی کا مقصد سمجھ بیٹھا ہے۔‘‘

ان کا مقصد پورا ہو جانے کی خوشی آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی۔ بیوی کو تو انھوں نے جیسے تیسے سمجھا دیا تھا لیکن خود کو وہ نہیں سمجھا پا رہے تھے۔

شیطان

ماسٹر جی بچوں کو کھانا دیتے ہوئے کہہ رہے تھے...... ''میں چاہ کر بھی تم لوگوں کے لئے وہ سب نہیں کر پاتا جو ایک معلّم کو کرنا چاہئے۔...... پانچ کلومیٹر دور سائیکل سے آنا پڑتا ہے...... نہ یہاں بس آتی ہے اور نہ ٹیمپو...... اسی وجہ سے یہاں کوئی آنا نہیں چاہتا......! تم تو جانتے ہو، جب سیوارام چھٹی پر رہتا ہے تو مجھے ہی گھنٹی بجانی پڑتی ہے......! کھانے کی کوالیٹی درست کرنے کی میں نے بہت کوشش کی، لیکن ناکام رہا۔ جو رقم حکومت سے ملتی ہے، وہ میرے پاس آتے آتے آدھی ہو جاتی ہے!''

ماسٹر جی کو مغموم ہوتا دیکھ کر، ایک طالب علم انھیں تسلی دینے لگا۔

''ماسٹر جی! آپ افسوس نہ کریں ...... ہم سب آپ کی مجبوری سمجھتے ہیں! میرے باپو کہہ رہے تھے کہ یہ لوگ شیطان ہیں...... جو روپیہ سرکار ہمارے لئے دیتی ہے، یہ اسے کھا جاتے ہیں۔''

میری ادھوری بات کو اس نے پورا کر دیا۔ انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور آگے بڑھ گئے۔

اپنے اپنے خواب

''ابو جی! انگریزی کے بڑے بڑے جواب مجھے یاد نہیں ہوتے، اس لئے میرے نمبر اچھے نہیں آتے۔ نہ معلوم میرے دوست انھیں کیسے رٹ لیتے ہیں۔ میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا کہ مجھے ہندی میڈیم کے اسکول میں داخلہ دلا دیجئے۔'' بیٹا ہاتھ میں رپورٹ کارڈ لئے کھڑا تھا۔ اس کی بات سن کر باپ کے چہرے کے آثار بدل گئے۔ وہ من ہی من سمجھ گئے تھے کہ بیٹے کے اس بار بھی اچھے نمبر نہیں آئے۔ وہ اپنے غصے کو دباتے ہوئے بولے۔

''بیٹا! میں انگریزی نہیں جانتا اسی لئے کمپنی میں بابو بن کر ہی رہ گیا۔ اور آگے نہیں بڑھ پایا...... میں تجھے بڑا صاحب بنانا چاہتا ہوں، اس لئے اتنی تکلیفیں اٹھا کر تجھے انگلش میڈیم کے اسکول میں پڑھا رہا ہوں۔''

''لیکن ابو جی......!'' بیٹا کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''بیٹا! اگر زندگی میں بڑا آدمی بننا ہے تو یہ تکلیف تو اٹھانی ہی پڑے گی!'' باپ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سختی سے جواب دیا۔

ان کی بات سن کر بیٹا رو پڑا۔ لیکن اپنے خواب کے لئے وہ کوئی بھی مصالحت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔

ٹریٹمینٹ

چونکہ پروفیسر موہن کے تعلقات بڑے بڑے سیاست داں لوگوں سے تھا۔ اس لئے پرانے پرنسپل ان کے مخالفت میں عملی اقدام کرنے سے ڈرتے رہے۔ نئے پرنسپل بہت ہی اصول پسند اور وقت کی پابندی کے حامی تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ پروفیسر موہن کے علم سے زیادہ سے زیادہ طلبہ فائدہ حاصل کرسکیں۔ اس لئے انھوں نے سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن وہ اپنی عادت سے باز نہیں آئے۔

ایک دن اچانک ہیڈ آفس سے اعلیٰ افسران کا وفد کالج کا جائزہ لینے کے لئے آیا۔ ایک کمرے میں بیٹھ کر کچھ طلبہ باتیں کررہے تھے۔ وفد نے ان سے دریافت کیا تو انھیں معلوم ہوا کہ پروفیسر موہن انھیں وقتاً فوقتاً ہی پڑھانے کے لئے آتے ہیں۔ انھوں نے کالج کا جائزہ لیا۔ کچھ دیر تک پرنسپل آفس میں بیٹھ کر انھوں نے معلومات حاصل کی اور واپس چلے گئے۔

پروفیسر موہن کے لئے لکھی آفیسر کی رپورٹ کو پرنسپل صاحب نے اپنی ٹیبل کے کانچ کے نیچے لگا دیا۔ آفیسر نے انھیں متنبہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ طلبہ کو علم کے زیور سے سنوارنا ہی استاد کی زندگی کا اولین مقصد ہے، جو اس مقصد سے گمراہ ہوجاتے ہیں، وہ آدھے، ادھورے استاد ہی مانے جاتے ہیں۔

دو چار دن میں ہی یہ خبر آگ کی طرح پورے اسٹاف میں پھیل گئی۔

ایک ماہ بعد پرنسپل صاحب اس آفیسر سے ٹیلی فون پر بات کر رہے تھے۔......

''سر! اب پروفیسر موہن پابندی سے کالج آ رہے ہیں اور تدریسی کام انجام دے رہے ہیں۔جیسا آپ نے کہا تھا، میں نے ویسا ہی کیا...... آپ کی رپورٹ کو ان کی ''سروس بک'' میں نہ لگا کر اپنی ٹیبل کے شیشے کے نیچے لگا دیا تھا...... جی! میں اب اس رپورٹ کو پھاڑ دوں گا......سر! آپ کا ٹریٹمینٹ پوری طرح کامیاب رہا۔''

غیر جانب داری

'بیلٹ بکس' کو سیل کرنے کے بعد الیکشن ٹیم اس ٹوٹے پھوٹے سرکاری اسکول کے برآمدے میں بیٹھ کر اس بس کا انتظار کر رہی تھی، جو کل انھیں وہاں چھوڑ کر گئی تھی۔

سبھی کی نگاہیں سامنے مرکوز تھیں۔ جہاں ایک نیتا جی سر جھکا کر کھڑے خستہ حال آدی واسیوں کے گروپ کو ڈانٹ رہے تھے......!

"رات کو دوسری پارٹی والوں نے تمھیں شراب پلائی، پھر بھگوان کی تصویر تمھارے سامنے رکھ کر، تمھیں ان کی پارٹی کو ووٹ دینے کے لئے قسم کھلائی اور تم انھیں ووٹ دے آئے......تم سب کے سب الو ہو اور زندگی بھر الو ہی بنے رہو گے!"

"الیکشن ٹریننگ" کے درمیان "غیر جانب داری" رکھنے کی بڑی بڑی باتیں جھوٹی ثابت ہو گئیں!"

پریسائیڈنگ آفیسر اپنے ساتھیوں سے کہہ رہے تھے۔

قدامت پرست

شادی کے بعد جب ارچنا پہلی بار مائیکے آئی تو اس کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح قائم رہنے والی مسکراہٹ غائب تھی۔ والدین سوچنے لگے کہ وہ لمبا سفر طے کر کے آرہی ہے۔ اس لئے تھکی ہوئی ہے۔ ماں کا جی نہیں مانا۔ انھوں نے بیٹے سے پوچھا ''بیٹا! ارچنا کے یہاں سب ٹھیک ٹھاک ہے؟''

''جی، ماں! مجھے تو دیدی کے گھر اور کنبے کے لوگ بہت اچھے لگے۔ ...... وہ بہت تعلیم یافتہ اور مہذب ہیں۔ سبھی نے آپ کو سلام کہا ہے۔''

''بیٹا! نہ معلوم کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ ارچنا اندر ہی اندر گھٹ رہی ہے۔ میں نے اسے اتنا اداس کبھی نہیں دیکھا۔''

''ماں! میں نے ٹرین میں دیدی سے پوچھا، لیکن انھوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔''

جب دوسرے دن بھی بیٹی کے چہرے پر اداسی کے آثار دکھے تو والد گھبرا گئے۔ انھوں نے اس سے پوچھا ''مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو......! کیا داماد جی کا پریوار اچھا نہیں لگا؟

''نہیں ابو جی...... وہاں سبھی لوگ بہت اچھے ہیں۔''

''پھر کیا بات ہے۔''

''ابو جی! آپ نے مجھے ہندی میڈیم میں تعلیم دی۔ مجھے ہندوستانی اقدار کی

تربیت کی۔ لیکن وہاں سبھی لوگ بہت ایڈوانس ہیں۔ وہ گھر میں بھی انگریزی بولتے ہیں۔ مجھے انگریزی نہیں آتی ہے۔ دیور جی اور نند کئی بار میرا مذاق اڑا چکے ہیں۔ وہ سب کہتے ہیں کہ میں قدامت پرست ہوں، مجھے اعلیٰ سوسائٹی میں نشست و برخواست کے آداب بھی نہیں آتے۔" یہ کہہ کر وہ باپ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

محبت

''جب تم امریکہ سے آئے ہو، مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ تم معین نہیں ہو۔''

''تمہارااندازہ سہی ہے، میں معین نہیں، ندیم ہوں......امن ندیم''

''میں تمہاری بات سمجھی نہیں۔''

''تم کو یہ نہیں معلوم کہ معین نے دوماہ قبل اپنی اسسٹینٹ سائنٹسٹ کے ساتھ شادی کرلی۔اسی وجہ سے تم سے ٹیلی فون پر بات کرنے سے کترارہا تھا۔

''میں تمہاری بات نہیں سمجھ پارہی ہوں۔''

''تم کوتو معلوم ہے، میں تمھیں کالج کے زمانے سے چاہتا ہوں۔تمھارے اور معین کے بیچ جب تعلقات گہرے ہونے لگےتو میں پیچھے ہٹ گیا۔لیکن جیسے ہی معین نے شادی کرلی، میری تمھیں پانے کی خواہش بیدار ہوگئی۔ میں ہر معاملے میں معین سے اچھا تھا۔بس میرے امدر ایک ہی کمی تھی کہ میں شکل وصورت سے خراب دکھائی دیتا تھا۔اس لئے میں نے امریکہ میں ہی پلاسٹک سرجری کرائی۔ تمھیں پانے کے لئےمعین کی صورت اختیار کر کے انڈیا آ گیا۔تمھارے لئے میں نے اپنا سارا کیریر داؤ پر لگادیا۔''

اس کی بات سن کراس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔''

''پچھلے تین دن سے تم سے مل رہا ہوں، لیکن میں تذبذب میں رہا۔اس لئے میں نے ارادہ کیا کہ شادی سے پہلے میں تمھیں حقیقت بتادوں۔ میں تمھیں ہر پل خوش رکھوں گا۔ یہ میراوعدہ ہے۔تم سے میں نے کل بھی کہا تھا کہ بڑے بھائی، بھابھی سے شادی کی بات کرو۔اوران سے میری ملاقات کراؤ۔''

"آج شام کو میں ان سے بات کروں گی۔" آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

وہ دونوں ریستوران سے باہر نکلے اور اپنے اپنے گھر کی طرف چل دیئے۔

دوسرے دن جب صبح ہوئی وہ اخبار پڑھ رہا تھا، تو ایک خبر پڑھ کر اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ایک دوشیزہ جو سائنٹسٹ تھی، اس نے خودکشی کر لی۔اس کے خط سے معلوم ہوا کہ محبت میں ناکامی کے سبب اس نے ایسا کیا۔

اس کی آنکھوں سے آنسو اخبار پر ٹپکنے لگے۔

اپنا اپنا درد

جھونپڑی کے باہر بابولال کھانستے ہوئے بیڑی پھونک رہا تھا۔

جب چنو کے رونے کی آواز بہت دیر تک بند نہیں ہوئی تو وہ دہاڑا...... ''کیسی ماں ہے تو...... بچہ روئے جا رہا ہے تو اسے دودھ نہیں پلا سکتی؟''

اندر سے جھلاہٹ بھری آواز بلند ہوئی ...... ''تمھارے پاس شراب کے لئے روپئے ہیں لیکن مجھے کھلانے کے لئے نہیں...... کچھ کھلاؤ گے تبھی تو دودھ نکلے گا......!''

''پانی کے سبب پوری فصل چوپٹ ہوگئی ...... سالا آدمی شراب نہیں پیئے تو کیا کرے......؟

اپنی کھنکھار کو زمین پر تھوکتے ہوئے وہ شراب کی دکان کی طرف چل دیا۔

جذبہ

آفس کے سبھی لوگ جا چکے تھے۔ زیادہ کام ہونے کے سبب آج انھیں رکنا پڑا تھا۔ اپنی فائیلیں نپٹا کر وہ کرسی سے اٹھنے والے تھے، تبھی ان کی نگاہیں کھڑکی کے باہر کے منظر پر ٹک گئیں۔ ورما بابو ایک ایک کمرے کو دیکھتے ہوئے اس طرف آ رہے تھے۔ ابھی تک انھوں نے اسٹاف کے لوگوں کی باتیں ہی سنی تھیں کہ ورما بابو آفس بند ہو جانے کے بعد کبھی کبھی یہاں نظر آتے ہیں۔ ایک آفس کا ملازم تو یہ کہہ کر ان کا مذاق اڑایا کرتا کہ انتقال کے بعد ان کی روح اسی آفس میں لٹکی رہے گی۔

باہر نکل کر انھوں نے چپراسی کو کمرے میں تالا لگانے کا حکم دیا۔ ورما بابو انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

''سر! ابھی بھی سب لوگ آپ کو یاد کیا کرتے ہیں...... آج بھی ہم لوگوں کے لئے آپ رہنما کی طرح ہیں۔

''میں بھی آپ لوگوں اور اس آفس کو اب تک فراموش نہیں کر پایا...... میری ملازمت کی ابتدا اسی آفس سے ہوئی تھی اور میں ریٹائر بھی یہیں سے ہوا۔ شروع، شروع میں یہاں صرف دو کمرے تھے...... یہ نئی عمارت میرے ہی سامنے بنی...... اس میں میں نے اپنے ہاتھوں سے ترائی کی تھی۔ وہ جو سامنے پیپل اور اشوک کے تین درخت دکھائی دے رہے ہیں وہ میں نے ہی لگائے تھے۔''

اس طرف دیکھتے ہوئے وہ کہیں کھو گئے۔ شاید ان کے دماغ میں سوئی ہوئی کوئی ماضی کی یاد یکایک کروٹ لینے لگی تھی۔ وہ ان کے چہرے کے نشیب و فراز کو دیکھ رہے

تھے۔ کچھ لمحے بعد ان کے خیال کا سلسلہ ٹوٹا اور دونوں زینے سے نیچے اترنے لگے۔

''یہ آفس میری رزق کا ذریعہ تھی ...... اسی سے میرے پورے کنبے کی پرورش ہوئی ہے۔ اسی لئے مجھے یہاں آنے کے بعد سکون ملتا ہے۔''

آخری زینے کے پائیدان پر قدم رکھتے ہوئے انھوں نے کہا اور گیٹ کی طرف چل دیئے۔

'اتنا جذبہ اگر تمام سرکاری ملازموں میں ہوتا تو اس محکمے کی اتنی حالت خراب نہیں ہوتی' اسکوٹر اسٹارٹ کرتے ہوئے وہ سوچنے لگے۔

نادانی

پونم ہندوستانی تہذیب کی بے حد مداح تھی، اسی لئے سبودھ اسے دقیانوسی کہہ کر ہمیشہ اس کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ آج صبح جب پونم نے اس سے کہا ''روس کے لوگ اپنی زبان سے کتنی محبت کرتے ہیں...... ایک ہم ہیں جو اپنی زبان کو کمتر مان کر غیر ملکی زبان کو بولنے میں اپنی شان سمجھتے ہیں''۔ تب سبودھ نے محسوس کیا تھا کہ پونم نے اسے چڑھانے کے لئے یہ طنز کیا ہے۔

آج وہ دونوں روس کے عظیم مصنف میکسم گورکی کی رہائش پر جانے والے تھے۔ وہ گورکی کی رہائش کے سامنے بس سے اترے۔ وہاں بھیڑ لگی تھی اور ایک گائڈ لوگوں کو بتا رہا تھا'' جب روسی انقلاب کامیاب ہوا تو سرکار نے ماسکو میں کاچالوا سٹریٹ پر اس عمارت کا انتخاب کیا۔ یہاں گورکی نے اپنی زندگی کے آخری پانچ سال گزارے تھے۔ اس عمارت میں گورکی کا کتب خانہ، اس کے کھانے کی ٹیبل، چائے کے پیالے وغیرہ اب تک حفاظت سے رکھے ہیں۔''

چونکہ پوری بات روسی زبان میں بیان کی گئی تھی اس لئے پونم کو معمولی بات ہی سمجھ میں آئی۔ سبودھ مکان کے باہر لگے بورڈ کو دیکھ رہا تھا۔ جس میں گورکی کی تصویر کے ساتھ اس کی سوانح لکھی ہوئی تھی۔

''پونم......!'' سبودھ نے آواز لگائی۔ پونم اس کے قریب آئی تو وہ بولا'' یہ وہ مکان ہے جہاں رومیاں رولاں، اینٹن چوکھو، ایچ. جی. ویلس، اسٹیفن وغیرہ جمع ہوا کرتے تھے۔ اور میکسم گورکی سے ان کی گفتگو ہوا کرتی تھی۔''

اسی وقت کہیں سے آواز آئی اور دونوں چونک اٹھے ...... آرٹسٹ، ادیبوں کو یہاں کتنا اعزاز واحترام ملتا ہے ...... اور ایک ہم ہیں جو انھیں یاد کرنے کی صرف رسم ادا کرتے ہیں!" گفتگو ہندوستانی زبان میں تھی۔ گورکی کی رہائش کو دیکھ کر چار پانچ لوگوں کا ایک وفد صدر دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ انھیں کے درمیان سے آواز آئی تھی۔

پونم تو وہیں کھڑی رہ گئی، لیکن سبودھ اپنی خوشی نہیں دبا پایا اور وہ ان سے ملنے چل دیا۔ چند لمحے بعد جب وہ لوٹ کر آیا تو مسرت آمیز لہجے میں بولا "وہ سبھی ہندوستانی سائنٹسٹ تھے۔ حکومت نے انھیں یہاں دو ماہ کے لئے بھیجا ہے۔ آج شام کو انھوں نے مجھے عشائیہ (Dinner) پر بلایا ہے۔ ہم لوگ آپس میں مل کر کتنے خوش ہوئے، اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔"

"چلو، آج اپنی مادری زبان اور ہندوستانی تہذیب کی عظمت اور اہمیت کو تو سمجھا......!"

"واقعتاً وہ میری نادانی تھی! ہماری زبان اور تہذیب کی اپنی پہچان ہے" یہ کہہ کر سبودھ نے پونم کا ہاتھ پکڑا اور دونوں گورکی کی رہائش والی عمارت میں اندر داخل ہونے لگے۔

دانش مندی

''سنئے! بیگم شرما کے پاس جیسا ہار ہے، ویسا ہی مجھے بھی چاہئے ......شرما جی تو آپ کے اسسٹینٹ ہیں، وہ اپنی بیگم کی خواہش پوری کر سکتے ہیں، لیکن آپ نہیں ......آخر میری بھی تو عزت ہے!'' چلتے وقت بیوی کے بولے گئے یہ جملے ان کے ذہن و دل پر ابھی بھی نشتر کی طرح پیوست ہو رہے تھے۔ گذشتہ ایک ہفتے سے وہ بیوی کے ایسے طنز سن رہے تھے۔ بے حد کوشش کے باوجود بھی کوئی مناسب کامیابی نہیں مل پائی تھی۔ یک بارگی ان کے چہرے کے تاثر بدلے۔ انھوں نے ڈرائیور سے پوچھا، ''بھوپال کے راشتے میں اپنے کتنے آفس ملیں گے؟''

''سر! چار ملیں گے!''

''میٹنگ بارہ بجے شروع ہوگی، اگر تم گاڑی تیز چلاؤ تو ڈیڑھ گھنٹہ بچ سکتا ہے۔ ہم چاہیں تو دو کا آبزرویشن جاتے وقت اور دو کا واپسی میں کر سکتے ہیں۔'' ڈرائیور نے رضامندی میں سر ہلایا۔ اور کار کی رفتار تیز کر دی۔

پہلی آفس کے آبزوریشن کے درمیان انھوں نے وہاں کے آفسر سے کہا ''گاڑی خراب ہونے کے سبب ایک دوست کی گاڑی بلوانی پڑی اس میں پٹرول بھروانا ہے، آپ ڈرائیور سے بات کرلیں۔''

آبزوریشن پورا کر صاحب ناشتہ کر رہے تھے کہ آفیسر بولا، ''سر! پڑول کے لئے

ڈرائیور کو تین ہزار دے دیئے ہیں۔"

صاحب کی گاڑی وہاں سے روانہ ہوگئی۔ سبھی دفتروں کا معائنہ اسی طرح ہوا۔ عہدے کے اثر سے فل ٹینک کی ہوئی گاڑی مل گئی۔ حکومت سے سفر کے اخراجات بھی مل جائیں گے...... ایک ہی دورے میں اتنے سارے دفاتر کا معائنہ کرنے کے سبب بڑے افسران بھی خوش ہو جائیں گے اور...... آج کے بعد انھیں بیوی کا وہ طنزیہ جملہ بھی سننے کو نہیں ملے گا۔

دوسرے دن جب گاڑی ہیڈ آفس کی طرف لوٹ رہی تھی تو صاحب پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر اپنی دانش مندی پر خوش ہو رہے تھے۔

پھیکا چہرہ

وہ جوتے پر پالش کرنے میں مصروف تھا۔ اس نے جوتے کو دیکھا۔ ابھی چمک باقی ہے! وہ پھر برش پھیرنے لگا۔

"بابو جی! سنا ہے؟ تمہارا بیٹا ڈپٹی کلکٹر ہے!"

"یہی تو میری تکلیف ہے بابا! اس سے تو اچھا ہوتا کہ میں اسے پیٹ کاٹ کاٹ کر پڑھاتا ہی نہیں۔ اس نے تو ہم سے رشتہ ہی ختم کر دیا۔ اب وہ اپنے آپ کو اعلیٰ خاندان کا سمجھنے لگا ہے۔ ذات برادری کے لوگوں سے اس نے ملنا، جلنا ہی بند کر دیا ہے۔ بیٹا اگر باپ کو باپ نہیں سمجھے تو بیٹے ہونے کا کیا فائدہ؟"

وہ دیکھ رہے تھے کہ جوتا تو چمک گیا تھا لیکن اُن کے چہرے کی چمک پھیکی پڑ گئی"۔

لگاؤ

ٹیلی فون ڈائری میں ایک نمبر کو تلاش کرتے ہوئے اس نمبر پر ان کی نظر ٹھہر گئی۔

انل کمار ورما-2483838

......کتنا نیک صفت آدمی تھا۔اس کی ایمانداری عملی دیانت داری کا ذکر دفتر میں ابھی بھی ہوتا ہے۔ایک ہر دل عزیز آدمی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ان ایام میں وہ سفر میں تھے۔اس لئے اس کی تجہیز و تکفین میں شریک نہیں ہو پائے تھے۔جس کا انھیں ہمیشہ افسوس رہا۔

اب اس نام کی ضرورت نہیں۔انھوں نے قلم نکالا،لیکن قلم وہیں جا کر ساکت ہو گیا......! بھلے ہی یہ انل جی سے ان کی گہری دوستی نہ رہی ہو،ایک لگاؤ ضرور رہا۔جسے دونوں نے ہمیشہ محسوس کیا۔

کبھی کبھی ان کی بیوی اور بچوں کے حال چال لے لیا کریں گے۔انھوں نے قلم کو جیب میں لگا لیا۔

ان کی آنکھیں اس نمبر سے ہٹ گئیں اور دوسرے نمبر کی تلاش میں ڈائری پر پھسلنے لگیں۔

راون

"راون نذر آتش" پروگرام کو دیکھنے ہزاروں لوگ میدان میں جمع تھے۔ شہر کے معزز رہنما جیون بابو اس پروگرام کے مہمان خصوصی تھے۔

"راون ہمارے دلوں میں برائی کی شکل میں موجود ہے، ہمیں اس راون کو نذر آتش کرنا ہے۔ تبھی پاکیزہ حکومت قائم ہوگی ......!" اپنی تقریر ختم کرنے کے بعد جیون بابو رضا کاروں سے گھرے راون کے بلند پتلے میں آگ لگانے کو آگے بڑھے۔ اسی وقت پتلے کے پیچھے سے آواز آئی......

"سالوں سے تم مجھے چھو کر ناپاک کر رہے ہو، لیکن اب یہ نہیں ہوگا۔ مجھے نذر آتش وہ کرے گا جو مجھ سے زیادہ اعلیٰ ہو!"

جیون بابو اور ان کے ساتھ چل رہے لوگ متحیر کھڑے تھے۔ چند لمحے بعد وہی آواز گونجی ...... "ارے منافقو! میں شیطان ہو کر بھی تم سے افضل ہوں ...... ہا ......ہا ......ہا......!"

سبھی نے چار پانچ نوجوانوں کو راون کے پتلے کے پیچھے سے نکل کر بھاگتے دیکھا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں لاؤڈ اسپیکر تھا۔

یکا یک راون کا پتلا دھوں دھوں کر جل اٹھا۔ لوگ تالیاں پیٹنے لگے اور جیون بابو دانت پیس کر رہ گئے۔

انسانیت

بھٹا چاریہ جی چھ ماہ قبل ہی کولکاتا سے تبادلہ کے بعد اندور آئے تھے۔ ان کے پڑوسی کنک بابو بہت ہی جھگڑالو خصلت کے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر وہ ان سے کئی بار لڑ چکے تھے۔ دونوں پریواروں کے درمیان ان دنوں گفتگو بند تھی۔

دسہرے کے دوسرے دن بھٹا چاریہ جی بیوی سے بولے ''یہاں کی روایت ہے کہ آج سبھی ایک دوسرے کو سونا پتی دے کر گلے ملتے ہیں، بزرگوں سے دعائیں لیتے ہیں۔ میں بھی اسٹاف کے لوگوں سے ملنے جا رہا ہوں'' انھوں نے سونا پتی کی شاخ سے پتیاں توڑ کر جیب میں رکھیں اور گھر سے نکل پڑے۔ باہر نکلتے ہی ان کا دھیان کنک بابو کے والد محترم کی طرف چلا گیا۔ وہ باہر کرسی پر بیٹھے تھے۔ ایک لمحہ انھوں نے کچھ سوچا، پھر ان کا گیٹ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ انھوں نے ان کے ہاتھ میں سونا پتی رکھی اور قدم بوسی کرتے ہوئے باہر نکل گئے۔

چار دن بعد کنک بابو کے والد کو اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر وہ چونک گئے۔

''بیٹا! اس دن تمھیں سونا پتی نہیں دے پایا تھا۔ آج موقع دیکھ کر آیا ہوں۔ ...... ہماری قسمت اچھی ہے کہ تمھارے جیسا ہمسایہ ملا...... خدا تمھیں ہمیشہ خوش رکھے۔''

انھوں نے سوناپتی دیتے ہوئے کہا

''آیئے ......تشریف رکھئے ......!'' بھٹاچاریہ جی انھیں سلام کرتے ہوئے بولے۔

''نہیں بیٹا! تم تو کنک کی خصلت سے اچھی طرح واقف ہو......اگر اسے معلوم ہوگیا کہ میں یہاں آیا تھا تو مجھے خواہ مخواہ اس کے طنز سننے پڑیں گے۔''

بھٹاچاریہ جی ہاتھوں میں سوکھی ہوئی سوناپتی لئے کھڑے تھے اور وہ انھیں دعائیں دیتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گئے۔

پینٹنگ

ٹیبل پر رکھی اس پینٹنگ میں ایک خوبصورت عورت گود میں بچے کو لئے دودھ پلا رہی تھی۔ بوسیدہ کپڑوں سے اس کا جسم جگہ جگہ سے نظر آرہا تھا۔ جیسے ہی انکتا کی نظر اس پینٹنگ پر پڑی، وہ بولی مما! یہ پینٹنگ کون لایا؟''

''یہ تیرے پاپا ممبئی سے لائے ہیں۔''

''ایسی تصویر...... ! یہ عورت فٹ پاتھ کے بھکاریوں کی طرح لگ رہی ہے۔ جنھیں دیکھ کر ہم نفرت سے اپنا منھ دوسری جانب پھیر لیتے ہیں۔''

''بیٹا ماڈرن سوسائٹی میں اسی طرح کی پینٹنگ ڈرائنگ روم میں لگائی جاتی ہے۔ جانتی ہو، اس کی قیمت ...... پورے دس ہزار روپئے ہیں۔''

شام کو جیسے ہی پاپا دفتر سے آئے، وہ ان کے گلے میں بانہیں ڈالتی ہوئی بولی ''اوہ پاپا! آپ کتنے اچھے ہیں...... آپ زمانے کے ساتھ چلنا جانتے ہیں۔''

پاپا اپنی تعریف سن کر مسکرا دیئے۔

بیٹی کتنی اسمارٹ ہے! یہ دیکھ کر مما کا من خوش ہوا تھا۔

میٹنگ

صاحب نے بیرے کو بوتل اور گلاس اٹھا کر کھانا لانے کا حکم دیا، پھر بولے،'' مسٹر ورما، ہر سال آفس اتنے سارے پروگرام منعقد کرتا ہے، اتنا خرچ کرتا ہے، لیکن کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آتا۔''

''سر! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سبھی مادری زبان کی تعریف یقیناً کرتے ہیں لیکن جب عملی طور پر اہمیت اور فوقیت دینے کی بات آتی ہے تو انگریزی کی حمایت میں کھڑے ہو جاتے ہیں!''

''جب تک دوہری ذہنیت رہے گی۔ تب تک کچھ بھی نہیں ہونے والا......!''

''جی......!''

''اس سے قبل ہندی ہفتہ پر منعقد پروگراموں میں کتنا خرچ ہوا؟''

''سر، تقریباً پندرہ ہزار......!''

''ٹھیک ہے...... پچھلے پندرہ دنوں سے میری کار گیریج میں کھڑی ہے۔ آپ آٹھ ہزار روپئے دے کر کار منگا لیں۔ باقی رقم کو پروگرام میں خرچ کرلیں۔ دیکھئے گا سبھی کام مناسب طریقے سے انجام پانے چاہئے۔''

''کھانے کے بعد جب بیرا بل لے کر آیا تو صاحب نے پوچھا'' کتنے کا بل ہے؟''

''سر سات سو روپئے کا......''

''اس خرچ کو بھی اسی میں شامل کرلینا۔'' اپنے ماتحت کو یہ حکم دے کر صاحب نے میٹنگ کو ختم کر دیا۔

تلخ حقیقت

گاؤں کے اس اسکول میں امتحانات چل رہے تھے۔ جن کے آبزرویشن کے لئے شہر سے بڑے آفیسر آئے تھے۔

آبزرویشن کے دوران کھڑکی سے اندر منظر دیکھ کر ان کے قدم رک گئے۔ ایک استاد طلبہ کو جواب لکھوا رہے تھے۔ وہ اس پر ناراض ہونے لگے۔ آواز سن کر ہیڈ ماسٹر صاحب بھی دوڑتے ہوئے وہاں آگئے۔ فوراً دوسرے استاد کی ڈیوٹی اس کمرے میں لگادی گئی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے میں اس استاد کو بلایا گیا۔ آفیسر کا چہرہ غصے سے لال تھا اور وہ استاد سے کہہ رہے تھے ''آپ استاد ہو کر نقل کراتے ہیں......! اگر آپ ہی ایسا کریں گے تو طلبہ کے درمیان استاد کی تصویر کیسے بن پائے گی؟ میں آپ کو سسپنڈ کردوں گا''۔

وہ استاد سر جھکائے کھڑا تھا۔ آفیسر کی باتیں ختم ہوتے ہی وہ بولا ''سر! اس اسکول میں ہم صرف تین استاد ہیں۔ نہ کوئی چپراسی ہے اور نہ دفتری ملازم، نئے تعلیمی سال کے آغاز ہوتے ہی ہماری ڈیوٹی مردم شماری میں لگی۔ اس کے بعد راشن کارڈ بنانے کی ذمے داری دے دی گئی۔ پھر اسمبلی اور پنچایتی انتخابات میں لگادیا گیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اگلے ماہ ریٹائر ہونے والے ہیں۔ جتنا ان سے اکیلے بن پڑا انھوں نے کیا۔ انھوں نے بچوں کو پڑھایا۔ انھیں دلیا بنا کر کھلایا۔ انھیں وجوہ سے تدریسی عمل ٹھیک طرح سے نہیں ہو سکا۔ ہم بھی ڈر رہے تھے کہ اگر اسکول کا رزلٹ خراب ہوجائے گا تو آپ ہم سب پر عملی اقدام کریں گے۔ یہ سوچ کر ہم نے بچوں کو ایک دو سوالوں کے جواب بتانے کا فیصلہ کیا......!''

جیسے جیسے استاد کی بات آگے بڑھتی گئی ویسے ویسے آفیسر کا چہرہ معمول پر آتا گیا۔

بلا

''ہم سبھی لوگ دو گھنٹے میں واپس آنے کا کہہ کر گھر سے نکلے، رات ہو گئی لیکن کسی نے بھی ہماری خیر، خیریت نہیں لی۔ تم بھلے ہی میری بات نہ مانو لیکن حقیقت یہی ہے کہ ان لوگوں کو ہماری فکر نہیں۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کو ہی اپنا کنبہ مانتے ہیں۔ تم اسے ٹیلی فون کر کے ہمیں لے جانے کو کہو، اگر وہ آجائے تو میں مان لوں گا کہ میری سوچ غلط ہے۔''

شوہر کی بات سن کر سیما جی فون لگانے لگیں۔

''ہیلو...... ہیلو...... بیٹا، میں ممّی بول رہی ہوں...... بھائی صاحب کو اچانک باہر جانا پڑا......! اگر تم گاڑی لے کر آجاؤ تو ہم رات کو ہی گھر آجائیں گے۔''

کچھ دیر انھوں نے بیٹے کی بات سنی، پھر بولیں۔ ''تو ٹھیک ہے بیٹا! ہم رات کو یہیں رک جائیں گے۔ کل صبح آٹو رکشہ سے گھر آجائیں گے!''

ان کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر شوہر بولے'' کیوں...... کیا بات ہوئی؟

''آپ سچ کہہ رہے تھے۔ وہ ابھی ابھی آفس سے آیا ہے، کہہ رہا تھا، آپ کو آنے کی جلدی کیوں ہے؟ بڑے ابو جی کا ہی تو گھر ہے......! ایک دو دن وہاں رک سکتے ہیں!''

''بیٹا اور بہو جب تک آفس سے گھر نہیں آتے، تب تک ہم کتنے بے چین رہتے ہیں۔ ایک یہ ہیں کہ ہمارے گھر سے باہر رہنے پر سوچتے ہیں کہ اچھا ہوا، کچھ دنوں کے لئے بلا ٹلی۔ ماں، باپ اور بہو بیٹے میں یہی فرق ہے۔''

شوہر کا درد ان کی باتوں سے ظاہر ہونے لگا اور سیما جی کے آنسوؤں سے!

احساسِ ذمّے داری

کام کرتے ہوئے وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھ لیتی، جیسے ہی اسے شوہر نظر آئے اس کا اداس چہرہ کھل اٹھا۔

وہ ان کے ہاتھ سے بریف کیس لیتی ہوئی بولی ''آج آپ کو بہت دیر ہو گئی۔''

''صرف بیس منٹ کی تو دیر ہوئی ہے۔'' شوہر نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''جب سے ٹرین میں بم حادثہ ہوا، تبھی سے مجھے آپ کی فکر لگی رہتی ہے۔ آپ بھی تو ٹرین سے آتے جاتے ہیں۔'' شوہر کے بریف کیس کو الماری میں رکھتے ہوئے وہ بولی۔

''میں نے تمھیں بتایا تھا کہ اس ٹرین میں ہمارے دفتر کا ایک بابو بھی تھا۔ آج وزیر اعلیٰ نے بم حادثے میں مہلوکین کے کنبے کو تین لاکھ روپئے اور گھر کے ایک ممبر کو نوکری دینے کا اعلان کیا ہے۔'' کپڑے بدلتے ہوئے شوہر نے کہا۔

بیوی چائے لے آئی۔ اس نے ٹرے کو ٹیبل پر رکھا اور شوہر کے ہاتھ میں کپ کو پکڑاتے ہوئے بولی ''حکومت نے اس بابو کے پریوار کو مدد دے کر اچھا کام کیا...... کم سے کم اس کے پریوار والوں کی پرورش تو ہو جائے گی۔'' دونوں چائے پینے لگے۔

''سنو! آج دفتر سے لوٹتے وقت میرے من میں خیال آیا کہ اگر اس دن میں بھی ٹرین میں ہوتا تو پریوار کو روپیہ مل جاتا، جس سے بیٹی کی شادی ہو جاتی اور بیٹے کی بھی نوکری لگ جاتی......!''

''مجھے حیرت ہے کہ اتنا سب سوچتے ہوئے آپ کو کہیں بھی میرا خیال نہیں آیا کہ آپ کے بغیر میرا کیا ہوگا......؟ آپ کو پورے کنبے کی فکر ہے لیکن میری ذرا بھی نہیں!''

شوہر سمجھ گئے تھے کہ ان کی بات سن کر وہ دلی طور پر مجروح ہوئی ہے۔ انھوں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''تم ناراض مت ہو......کئی بار ذمے داری کا پہلو اتنا وزنی ہو جاتا ہے کہ آدمی اس کے سوا کچھ سوچ ہی نہیں پاتا......!''

اس کی مغموم نگاہیں بیان کی صداقت کا مظاہرہ کرنے لگیں۔

بے بسی

''آپ بھی عام آدمی جیسے ہو گئے ہیں جو کبھی بھی ظلم وزیادتی کی مخالفت نہیں کرتا۔ اپنی غلط بات کو منوانے کے لئے پنکج نے آپ کو گالیاں بکی۔ اسٹاف روم میں آ کر توڑ پھوڑ کی اور آپ نے ابھی تک اس کی شکایت نہیں کی۔''

ان کے غصے کو ٹھنڈا کرتے ہوئے ان کے ایک رفیق کار نے انھیں سمجھایا۔ ''سر! آپ نئے نئے آئے ہیں۔ اس لئے اس کالج کی سیاست نہیں جانتے! ہماری شکایت کو یہاں ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا جاتا ہے۔''

''میں اب ایسا نہیں ہونے دوں گا...... ! میں شکایت نامہ تیار کرتا ہوں۔ آپ سبھی اس پر دستخط کریں۔'' یہ کہہ کر وہ شکایت نامہ تیار کرنے لگے۔ انھوں نے اس پر سبھی کے دستخط کرائے اور اسے پرنسپل کے پاس بھجوا دیا۔

دوسرے دن کالج میں آتے ہی انھیں پرنسپل کا حکم ملا اور پرنسپل آفس کی طرف چل دیئے۔

''آیئے سوریہ ونشی جی! اب آپ کے والد صاحب کی صحت کیسی ہے؟'' پرنسپل صاحب کے سامنے بیٹھے چندو بابو نے ان سے سوال کیا۔

''ٹھیک ہے بھائی صاحب...... اگر آپ میرا تبادلہ یہاں نہیں کراتے تو میں اس چھوٹے سے قصبے میں ان کا علاج کیسے کرا پاتا؟ آپ کی وجہ سے ہی انھیں زندگی ملی ہے۔'' انھوں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''سنا ہے، آپ نے پنکج کی شکایت کی ہے...... وہ تو اچھا ہوا کہ پرنسپل صاحب

نے مجھے وقت پر خبر دے دی...... اگر وہ شکایت تھانے میں درج ہوگئی ہوتی، تو آپ کے لئے یوں ہی پریشانی کھڑی ہو جاتی...... پنکج میری پارٹی کا ہونہار رضا کار ہے۔ آئندہ ایسی غلطی مت کیجئے گا'' اپنی بات مکمل کر کے وہ کرسی سے اٹھ گئے۔

''بھائی صاحب! چائے لے کر جایئے گا'' پرنسپل نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا، مگر وہ ان کی پیش کش کو ٹالتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔

''وہ تو اچھا ہوا کہ آج بھائی صاحب کا موڈ ٹھیک تھا ورنہ ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔ میں آپ کی ہمت کی داد دیتا ہوں۔ جس نے آپ کی اتنی مدد کی، آپ نے اسی کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا'' پرنسپل شکایت نامہ کو پھاڑتے ہوئے بولے۔

وہ مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھے تھے۔

لاٹری

ممّی ! آج میں امن چچا کے یہاں گیا تھا...... پورا گھر نیا نیا لگا......مکان میں رنگ ہو گیا، فرنیچر بن گیا اور نئی کار بھی آ گئی......!''

بیٹے کی بات سن کر بیوی شوہر کا چہرہ دیکھتی ہوئی بولی ''کیوں؟ کیا امن بھیا کی لاٹری لگ گئی؟''

ایسا ہی سمجھو...... وہ میرا دوست ہے۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ روپے ملنے کی امید میں ہی وہ روپے خرچ کرتا ہے۔ اب اسے لڑکے کی شادی کرنی ہے اور تم تو جانتی ہو بغیر ان ظاہری چیزوں کے رشتے اچھے نہیں آتے......!''

دوست کے لاٹری لگنے کی تشریح شوہر نے پیش کر دی۔

ڈگری

''شرما جی! راکیش ان دنوں رادھے شیام جی کے ساتھ دکھائی دیتا ہے...... کیا اس نے بھی نیتا گری شروع کر دی......؟''

سکینہ صاحب کی بات سن کر شرما جی کا چہرہ اتر گیا۔

''بھائی صاحب! بغیر کچھ نذر و نیاز کئے نوکری نہیں لگتی ......رادھے شیام جی نیتا ہیں، کبھی ان کی نظر عنایت ہو جائے گی تو بیٹا روزگار سے لگ جائے گا۔ آپ ہی بتایئے اگر مجھے نیتا گری ہی کرانی ہوتی تو اتنی مصیبت اٹھا کر اسے ایم.کام نہیں کراتا!''

''آپ درست فرما رہے ہیں ...... ہمارے یہاں چپراسی سے لے کر آفیسر تک کے عہدوں کے لئے ڈگری کی ضرورت پڑتی ہے۔ مگر نیتا بننے کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہوتی!''

سکینہ صاحب کو احساس ہو گیا تھا کہ لاعلمی میں انھوں نے شرما جی کی دکھتی ہوئی نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔ اسی وجہ سے انھیں بات سنبھالنی پڑ رہی تھی۔

بڑے آدمی

جیسے ہی انھیں معلوم ہوا کہ شیام بابو گاؤں گئے ہیں، انھوں نے گاڑی گاؤں کی طرف موڑ دی۔

''ورما جی! ان دونوں پریواروں میں مجھے شیام بابو کا پریوار اچھا لگ رہا ہے ...... آپ کو تو معلوم ہے کہ ایک ہی بیٹا ہے، اس کی شادی کسی بڑے آدمی کے پریوار میں ہو جائے ...... وہ آرام سے رہے ...... ہم شوہر بیوی کی یہی خواہش ہے۔ جب سے آپ نے شیام بابو کا ذکر فون پر کیا ہے، تبھی سے میں یہاں آنے کی سوچ رہا تھا۔ مگر رخصت نہیں ملنے کے سبب کچھ تاخیر ہو گئی۔''

''کوئی بات نہیں ...... ہر کام کے لئے وقت متعین ہے۔ انوپم جی! آپ جیسا کنبہ چاہتے تھے یہ ویسا ہی پریوار ہے۔ سیاست اور سماجی خدمت کے میدان میں ان کا نام ہے۔ ...... سیکڑوں ایکڑ زمین ہے ...... دولت بے شمار ہے ...... سارے شہر میں ان کا دبدبہ ہے ...... ہر طرح کا عیش و آرام ہے۔ بیٹی راج کرے گی۔'' ورما جی خوش ہو کر بولے۔

چاروں طرف فصیل سے گھرا وسیع صحن تھا۔ اس کے درمیان عالیشان عمارت تھی۔ گیٹ کے باہر گاڑی کھڑی کر کے دونوں دوست حویلی کی طرف جانے لگے۔ ابھی کچھ ہی دور چلے ہوں گے کہ درختوں کے پیچھے سے آتی آواز سن کر وہ چونک گئے اور اس جانب دیکھنے لگے ...... ایک آدمی درخت سے بندھا تھا اور کچھ لوگ اسے پیٹ رہے تھے۔

''حرام خور! شیام بھائی کا نمک کھاتا ہے اور انھیں کو شیطان کہتا ہے ......

غریبوں کی زمین پر ناجائز قبضے کا الزام لگاتا ہے......!''

''مجھے مت مارو...... میں اس وقت نشے میں تھا، اس لئے منہ سے نکل گیا...... شیام بھائی تو فرشتہ ہیں...... مجھے چھوڑ دو......اب میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔'' وہ آدمی روتے ہوئے ان سے کہہ رہا تھا اور وہ اسے بے رحمی سے مار رہے تھے۔

ان کے چہرے پر تناؤ کے آثار دیکھ ورما جی بولے۔انوپم جی! بغیر یہ سب کئے آج بڑا آدمی نہیں بنا جا سکتا!''

''ورما جی! اس سے تو وہ لڑکا اچھا ہے...... متوسط درجے کا کنبہ ہے تو کیا ہوا ......؟ ایم.بی.اے.تو ہے...... ابھی پندرہ ہزار مل رہے ہیں، لیکن پریوار مہذب اور بااخلاق ہے''۔اس منظر نے ان کے بڑے آدمی کے گھر میں رشتہ کرنے کے فیصلے کو بدل دیا۔

دونوں گاڑی کی طرف لوٹنے لگے۔

خیال اپنے اپنے

جب بیٹے کی کہیں نوکری نہیں لگی تو باپ نے ریٹائرمینٹ کے وقت ملی رقم سے اسے ایک چھوٹا سا جنرل اسٹور کھلوادیا۔ ان کی صحت اکثر خراب رہنے لگی۔ اس لئے ان کی خواہش تھی کہ بیٹے کی شادی جلد از جلد ہو جائے۔ انھوں نے تین چار رشتے بھی دیکھے، لیکن اس نے لڑکی کو ناپسند کر دیا۔ اس وجہ سے ان کے ذہن میں بیٹے کے متعلق کئی طرح کے شکوک پیدا ہوئے۔

دوپہر کو بیٹا جب کھانا کھانے گھر آیا تو باپ نے سخت لہجے میں بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے بولا:

"کیا زندگی بھر غیر شادی شدہ، بغیر شادی کے گذارنے کا ارادہ ہے یا کوئی لڑکی پہلے سے دیکھ رکھی ہے...... کبھی تو کچھ بولو کہ تمھیں کیسی لڑکی چاہئے......؟"

وہ نیچی نگاہیں کئے خاموش بیٹھا رہا، ماں نے اس کے سامنے کھانا رکھ دیا۔

جب وہ کھانا کھا کر چلا گیا تو ماں انھیں سمجھانے لگی۔ "بیٹا جوان ہو گیا ہے...... آپ کو اس سے محبت سے بات کرنی چاہئے۔ اس کی کوئی بھابھی یا دیدی تو ہے نہیں جن سے وہ من کی بات کہہ سکے...... میں آج رات کو اس سے پوچھوں گی، پھر آپ کو بتاؤں گی...... آپ تو بے مقصد نہ معلوم کیا کیا سوچتے رہتے ہیں!"

رات کو ماں نے جب اس سے پوچھا تو وہ شرماتے ہوئے بولا، "ماں! آپ کو تو معلوم ہے گھر کی تمام جمع پونجی اس دکان میں لگ گئی...... میں بہت کوشش کر رہا ہوں، پر

دکان جم نہیں پا رہی ہے۔ میں کھانا کھانے گھر آتا ہوں یا مال لینے جاتا ہوں تو دکان بند رہتی ہے...... میں چاہتا ہوں کہ تعلیم یافتہ اور خوبصورت لڑکی مجھے مل جائے تو ایسے وقت وہ دکان سنبھال لیا کرے گی۔ ماں! آگے خرچ بڑھنے ہیں، اس لئے میں نے یہ سوچا ہے۔ میں ابو جی کو سمجھانے کی ہمت نہیں کر پا رہا ہوں۔ اگر آپ انھیں سمجھانے کی کوشش کریں تو شاید......!"

دوسرے دن جب بیٹا کھانا کھانے کے لئے گھر آیا تو باپ بولا "بیٹا! آج زمانہ بدل گیا ہے۔ لڑکے لڑکیاں سبھی برابر مانے جا رہے ہیں۔ تمھارا فیصلہ مناسب ہے، بیٹا! میری سوچ موجودہ حال تک محدود تھی لیکن تمہاری مستقبل تک ہے......!"

بیٹا تشکر بھرے انداز میں ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

سبھی کے چہرے مسرّت سے کھل اٹھے۔

ضد

جب سے پڑوس میں شمیم صاحب کا کنبہ رہنے لگا، تبھی سے مونو کو لے کر ممّی پاپا کا تناؤ بڑھ گیا۔

شمیم صاحب سرکاری آفیسر تھے۔ روپیوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ نیا سے نیا اور قیمتی سے قیمتی سامان وہ اپنے بیٹے سنجو کے لئے لاتے۔ سنجو ان چیزوں کو مونو کو ضرور بتاتا اور وہ انھیں خریدنے کی ضد آئے دن ممّی پاپا سے کیا کرتا۔

کل سنجو اپنی چمکدار پستول مونو کو دکھلاتے ہوئے بولا ''تمھارے پاس کیا ایسی پستول ہے......؟ یہ میرے پاپا دیوالی کے لئے میرے لئے لائے ہیں......!''

پستول دیکھ کر اس کا من للچا اٹھا۔ اس نے جیسے ہی پستول اس سے دیکھنے کے لئے مانگی، ویسے ہی انگوٹھا دکھا کر اسے چڑھاتے ہوئے وہ اپنے گھر کی طرف دوڑ گیا۔ وہ پستول اسے اتنی اچھی لگی کہ چاہ کر بھی وہ اسے نہیں بھلا پا رہا تھا۔

آج جب وہ ممی پاپا کے ساتھ بازار سے نکل رہا تھا تو وہ پستول دکان کے شوکیس میں لگی دیکھ کر مچل اٹھا۔ باپ نے دکاندار سے اس کی قیمت پوچھی۔ جب دکاندار نے اس کی قیمت تین سو روپئے بتلائی تو وہ اسے سمجھانے لگے۔ ''بیٹا! اس کی جگہ تم دوسری کوئی چیز لے لو...... میں تمھیں رنگ برنگے پھلجھڑیاں اور خوبصورت پٹاخے دلا دوں گا!''

''نہیں......نہیں...... میں وہی پستول لوں گا جو سنجو کے پاس ہے!'' وہ روتے ہوئے زور زور سے کہنے لگا۔ دکان میں کھڑے لوگ ان کے بارے میں کیا سوچ رہے

ہوں گے؟ پاپا کا چہرہ غصے سے لال ہو اٹھا۔ ممی نے حالت کو سنبھالا۔ انھوں نے اس کے کان میں کچھ سمجھایا اور وہ چپ ہو گیا۔

رات کو اس کے پاپا ممی سے بولے ''جب سے اس کی دوستی نجو سے ہوئی ہے، تبھی سے اس کی مانگیں بڑھتی جا رہی ہیں...... اتنی بار اسے سمجھایا کہ اپنے برابر والے بچوں سے دوستی کرو لیکن یہ مانتا ہی نہیں......! ہاں، دکان میں تم نے اسے کیا سمجھایا کہ وہ اپنی ضد چھوڑ بیٹھا؟''

''......میں نے اس سے کہا تھا کہ تم اپنے ممی پاپا بدل لو۔ نجو کی ممی پاپا امیر ہیں وہ تمھیں روز نئی چیزیں لا کر دیں گے۔ تم انھیں ہی اپنا ممی پاپا بنا لو......!''

''اچھا تو یہ بات ہے۔ اس لئے وہ ایک پل کے لئے بھی تمھیں نہیں چھوڑ رہا تھا ......ابھی بھی دیکھو کیسے تم سے چپک کر سو رہا ہے!''

سنئے! ابھی ابھی وہ نیند میں بڑبڑا رہا تھا......'اب میں کبھی نجو سے بات نہیں کروں گا...... میں اپنے ممی پاپا نہیں بدلوں گا! آپ بے فکر رہئے، میں نے اسے گھر آ کر سمجھا دیا ہے، اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اب وہ کبھی ضد نہیں کرے گا۔''

ان کی نظریں مونو کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

اوہ! یہ کتنا بھولا...... کتنا معصوم ہے! وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

انسانیت کا نور

میری زندگی بے معنی ہی گزر گئی! یہ فکری درد انھیں جسم کے زخموں سے زیادہ تکلیف دے رہا تھا۔

چوبیس گھنٹے کے بعد انھیں ہوش آیا تھا۔ ان کا پورا کنبہ ہسپتال میں جمع تھا۔ وہ شہر کے بڑے تاجر تھے۔ گاؤں میں بھی ان کی زمین تھی۔ ہر اتوار کو وہ گاؤں جایا کرتے۔ اس بار گاؤں سے واپس ہوتے وقت ان کی گاڑی درخت سے ٹکرا گئی۔ ڈرائیور کی جائے حادثہ پر ہی موت ہوگئی۔ کچھ لوگوں نے ہمدردی میں انھیں ہسپتال پہنچایا۔

اپنے رشتے داروں، متعلقین، تجارتی دوستوں اور کنبے کے ممبران کو دیئے گئے فریب، دھوکے اور کذب بیانی کے بیشتر مناظر ہوش میں آتے ہی ان کے ذہنی اسکرین پر نمودار ہونے لگے۔

رات کو انھوں نے ڈاکٹر کو بلایا اور گھر کے لوگوں کو کمرے کے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

"ڈاکٹر صاحب! مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ کل میرا آپریشن ہوگا، جس میں میرے بچنے کی امید بہت کم ہے...... کوئی نہیں جانتا کہ باہر سے صحت مند نظر آنے والا جمشید بہادر، زندگی بھر ذہنی مرض کا شکار رہا...... ڈاکٹر صاحب! اب میں با ایمان اچھے انسان کی موت مرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنی ملکیت سے غرباء، مساکین، تعلیمی فروغ اور رفاہ عام میں خرچ کرنا چاہتا ہوں...... ! مجھے آپ کی مدد...... !"

ان کی آواز بکھر گئی اور آنسوؤں کا سیلاب امڈ پڑا۔ ڈاکٹر نے فوراً سبھی ضابطے کو عملی جامہ پہنایا۔

دوسرے دن کنبے والے روتے ہوئے غم زدہ، انھیں گھر لے جا رہے تھے لیکن ان کے چہرے پر آئی تبدیلی سے وہ حیرت میں تھے۔ جس چہرے پر کل تک خوف، درد اور بے صبری تھی وہ آج انسانیت کے نور سے چمک رہا تھا۔

پشیمانی

''یہ جوتے کتنے کے ہیں......؟''

''صاحب آٹھ سو پچاس روپئے کے......''

دکاندار سے بھاؤ سن کر معین بابو نے اپنے بیٹے کو دھیرے سے سمجھایا۔ ''ندیم! میں تمھیں دوسری دکان میں لے کر چلتا ہوں ...... یہ جوتے بہت مہنگے ہیں!''

دونوں اس دکان سے باہر نکلنے لگے۔

''.........ارمان کے پاپا اور میرے پاپا ایک ہی عہدے پر ہیں لیکن دونوں میں کتنا فرق ہے۔ اس کے پاپا اس کی ہر مانگ پوری کرتے ہیں۔ اس کی ہر چیز کتنی اچھی ہوتی ہے۔ اور میرے پاپا، ایک چیز کو خریدتے وقت کتنا سوچتے ہیں؟ اپنے من پسند جوتوں کو نہ خرید پانے کے سبب ندیم من ہی من جھلا رہا تھا اور اپنے پاپا کی کنجوسی پر اسے غصہ آ رہا تھا۔

''میں جو کپڑے پہنتا ہوں، اس سے اچھے تمھیں پہناتا ہوں ...... تم تسلی رکھو ...... میں تمھیں اچھے جوتے دلاؤں گا...... بیٹا! ایمانداری کے پیسے کو فضول خرچ کرنے کی ہمت میرے اندر نہیں ہے...... تم بڑے ہو کر سمجھو گے کہ ایمانداری اور بے ایمانی کی دولت میں کیا فرق ہوتا ہے!''

اپنی بات پوری کر پاپا نے ندیم کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ چاہ کر بھی نگاہیں اوپر نہیں کر پا رہا تھا۔

اس کے من میں اپنے اور ارمان کے پاپا کی جگہ بدلنے لگی۔

محنت کش

گندے- پھٹے کپڑے...... سیاہ رنگ...... بغل میں ایک چھوٹا سا جھولا اور ہاتھ میں بانسری لئے وہ جیسے ہی اس ڈبے میں چڑھا ایک نوجوان سے ٹکرا گیا۔

''اندھے ہو کیا! دیکھ کر نہیں چل سکتے!''

''بھائی صاحب! معاف کرنا، میں نابینا ہوں، ذرا مجھے آگے پہنچا دیجئے۔ خدا آپ کا بھلا کرے گا۔''

اس آدمی نے رحم کھا کر اس کا ہاتھ پکڑا اور ڈبے کے درمیان کھڑا کر دیا۔ اس نے بانسری ہونٹوں پر لگائی اور مسحور کن آواز نکالنے لگا۔

'چاہے جہاں کھڑے ہو جاتے ہیں سالے بھیک مانگنے کے لئے'

'ارے! یہ بہت فریبی ہوتے ہیں، موقع ملتے ہی سامان لے کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں، اس کے کانوں میں پڑنے والے یہ جملے اس کی ریاضت کو منتشر نہیں کر پائے اور وہ دل جمعی سے بانسری بجاتا رہا۔ لوگ وجد میں جھوم اٹھے۔

جیسے ہی بانسری کی آواز بند ہوئی، لوگ 'واہ واہ' کرتے ہوئے اسے پیسے دینے لگے۔

''بابو صاحب! میں نابینا ہوں، بھکاری نہیں! میں تو بانسری بنا بنا کر بیچتا ہوں۔'' اس کی بات سن کر سبھی کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

اس کی دو بانسری فروخت ہوئیں۔

اس نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔ گاڑی رکتے ہی وہ اترا اور محنت کا سبق پڑھانے دوسرے ڈبے میں چڑھ گیا۔

بدلتے پیمانے

چائے کی دکان پر نوجوانوں کا ایک گروپ سیاست کی موجودہ صورت حال پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔

''یار! آج کا اخبار پڑھ کر ذہنی اذیت محسوس کر رہا ہوں۔ اب کوئی نہ کوئی فیصلہ ہمیں لینا ہی پڑے گا۔''

''تم سچ کہہ رہے ہو! کانتی بھائی! اپنے علاقے میں پندرہ جگہ پرچم کشائی کے پروگرام میں شریک ہوئے اور ہمارے نیتا جی صرف تین جگہ...... ! یہ کہتے ہیں کہ پرچم کشائی آٹھ بجے کے پہلے ہی ہونا چاہئے، اپنی انھیں اصولوں کے سبب وہ اپنا دائرۂ اثر کھوتے جا رہے ہیں!''

''مجھے نہیں لگتا کہ یہ سیاست میں کامیاب ہو پائیں گے! ان کا اصول ہمارے مستقبل کو برباد کر دے گا۔''

ان میں بحث چلتی رہی۔

دس منٹ بعد جب وہ وہاں سے اٹھے تو ان کا نیتا بدل چکا تھا۔

اصرارِ گناہ

مہرہ صاحب اپنے محکمہ کے اعلیٰ افسر تھے۔ حسبِ روایت ''قومی تیوہار'' پر انھوں نے پرچم کشائی کی رسم ادا کی۔ اس کے بعد انھوں نے اپنا خطاب اس طرح ختم کیا۔

''......ملک ہمارے لئے اولین نیاز منداور قابل تعظیم ہے۔ ہمیں پورے ایمان ویقین کے ساتھ کام کرکے اسے ترقی کی بلندی پر پہنچانا ہے۔''

اخبار میں دینے کے لئے تصویر بھی لے لی گئی۔ اور ان کے خیالات بھی قلمبند کر لئے گئے۔ ناشتے کے وقت مہرہ صاحب اسٹاف سے گھرے کھڑے تھے۔ کوئی ان کے خیالات کی تعریف کر رہا تھا تو کوئی ان کی حکمت عملی کی۔ ہال کے کونے میں دو نوجوان کانا پھوسی کر رہے تھے۔

''قومی پرچم کے نیچے کھڑے ہو کر لوگ اس قدر جھوٹ کیسے بول لیتے ہیں؟ مجھے ان کے اصرارِ گناہ پر تعجب ہوتا ہے!'' یہ سن کر دوسرے نے جواب دیا۔

''اسی وجہ سے ان کی باتیں دل میں اتر نہیں پاتیں ہیں اور آفس میں لگے اس اشتہار ''دیوار گندی نہ کریں'' کی طرح بے معنی ہو جاتی ہیں۔

ممتا

جب ونا یک فوج میں بھرتی ہوا، تبھی سے ڈاکیئے کی آواز سنتے ہی ممی جی کے قدم گھر کے باہر اٹھ جایا کرتے، آج بھی ایسا ہی ہوا، ڈاکیئے نے 'شرما جی' کہہ کر آواز لگائی اور خط پڑوسی کی لیٹر بکس میں ڈال دیا۔

ماتا جی! آپ کا کوئی خط نہیں......! کہتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا۔

''دیور جی کا انتقال ہوئے دو ماہ ہو گئے، پر ممّی جی ان کے خط کا آج بھی انتظار کیا کرتی ہیں۔'' اس نے شوہر سے کہا۔

ممّی جی نے اندر داخل ہوتے بہو کی یہ گفتگو سن لی۔

''بیٹا! میں جانتی ہوں کہ ونا یک اس دنیا سے دور چلا گیا۔ لیکن نہ معلوم کیوں، جب بھی ڈاکیا آتا ہے، میں یہ بھول جاتی ہوں!'' اپنی بات پوری کر کے ممّی جی آنسو بھری آنکھوں سے دیوار پر لگی بیٹے کی تصویر دیکھنے لگیں۔

دونوں کو لگا جیسے ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ ونا یک کو درازیِ عمر کی دعا دے رہی ہوں۔

آدمی

''داس بابو! نئے صاحب اتنی جلدی رشتے کیسے بنا لیتے ہیں؟ ان کا اعلیٰ افسران کے گھر آنا جانا ہے۔ ودھا یک جی کو بھی انھوں نے اپنے قبضے میں کرلیا ہے۔ سنا ہے ان کی بیوی کو دیدی بولتے ہیں۔''

''ورما جی! میں ان کے ساتھ کام کر چکا ہوں۔ یہ اپنے فائدہ کے لئے کسی کے بڑے بھائی بن جاتے ہیں، کسی کے چھوٹے بھائی! کسی کی بیوی کو بہن بنا کر اس کے گھر میں داخل ہو جاتے ہیں۔''

''......لیکن یہ تو تاثراتی بلیک میل ہے!''

''آپ درست فرما رہے ہیں، مگر انھیں اس سے کوئی مطلب نہیں۔ ان کا کام نکلا اور رشتہ ختم ہوا۔''

دونوں اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

رات کو ورما جی کا بیٹا ہاتھ میں کتاب پکڑے ہوئے ان کے پاس آیا ''پاپا! عہدِ اولین کا آدمی کیسا ہوتا تھا......؟''

''بیٹا! وہ جانوروں کی طرح تھا۔ وہ صرف اپنے متعلق ہی سوچتا تھا۔ رشتوں کی اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں تھی۔'' یہ بتاتے ہوئے لمحہ بھر کے لئے ان کے دماغ کے اسکرین پر نئے صاحب کا چہرہ نظر آنے لگا۔

نیک اولاد

......اگر دوستوں کے ساتھ پارٹی منانے جاتا ہوں تو دوسو روپے چاہئے۔ ماں دن بھر پیٹی کوٹ سلتی ہے تب کہیں جا کر سو روپے کماتی ہے۔ ابو جی کو بھی ان دنوں اس کی پڑھائی کا خرچ بڑھ جانے کے سبب پارٹ ٹائم کرنا پڑ رہا ہے، ان سے روپے مانگنے کی ہمت میں کیسے کر سکتا ہوں؟ اگر دوستوں کو منع کروں گا تو وہ میرا مذاق اڑائیں گے......کیا کروں......؟

''بیٹا! کیا آج کالج نہیں جاؤ گے؟'' ماں کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔

''ماں! میں آج کالج نہیں جاؤں گا......!'' اس کے منھ سے یکا یک نکل گیا۔

اس کی بات باپ نے سن لی تھی۔ وہ اسے سمجھانے لگے...... ''بیٹا! کالج نہیں جانے سے تمھارا نقصان ہوگا......کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی اہم ٹاپک آج پڑھا دیا جائے۔''

''بابو جی! آج کوئی بھی کلاس میں نہیں بیٹھے گا......سبھی پکچر جائیں گے اور ہوٹل میں پارٹی منائیں گے۔ اس لئے میں نے سوچا کہ میں کالج نہیں جاؤں گا!'' اس کی بات سن کر دونوں حیرت میں پڑ گئے۔

''بیٹا! تم بہت سمجھ دار ہو! تم جو کہو گے، میں گھر پر وہی بنا کر تمھیں کھلاؤں گی۔'' یہ کہتے ہوئے ماں کا دل بھر آیا۔

''بیٹا! اچھا ہوا، تم آج کالج نہیں گئے، تمھاری وجہ سے شام کو مجھے بھی کوئی عمدہ نفیس پکوان کھانے کو مل جائے گا۔'' باپ کے اس جملے نے پورے ماحول کو ہی بدل دیا۔

خوبصورت بت

رما تیار ہو رہی تھی اور دانش صوفے پر بیٹھا سوچ میں ڈوبا تھا۔ دو سال ہو گئے، رما کو اس کی زندگی میں آئے۔ اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اسے رما جیسی شریک حیات ملے گی۔ تیکھے ناک نقشے، گورے سفید رنگ کے سبب وہ اسے خوبصورتی کی مثال لگتی تھی۔ لیکن چند ماہ بعد ہی اس کی امیدیں ایک ایک کر کے منتشر ہونے لگیں۔ رما اس کے پریوار کے لوگوں کو پسند نہیں کرتی تھی۔ روز روز کے آپسی تنازعہ کے سبب اس نے اپنے گھر کے افراد کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس نے سوچا تھا کہ گھر سے الگ ہو کر وہ سکون سے رہ لے گی۔ مگر......!

رما کے جیون کی ہر سوچ اس کی زیب و زینت کے اردگرد ہی گھومتی تھی۔ کاش ......وہ جتنی خوبصورت ہے کاش وہ اتنی ہی خوب سیرت ہوتی۔ دوسروں کو خوش کرنے میں کتنا سکون ملتا ہے۔ اس نے کبھی جانا نہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو انا کا سوال بنا کر منھ پھلا لینے کی عادت کے سبب وہ مجھ سے ہی نہیں، بلکہ پورے پریوار سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ عورت تو کتنی متاثر کن ہوتی ہے، پر رما......؟

''سنو! سب سے پہلے ساڑی کی دکان پر چلنا ہے، میں نے جس رنگ کی ساڑی منگوائی تھی وہ آ گئی ہے دکان سے فون آیا تھا۔'' اسے سمجھاتی ہوئی وہ باہر نکل گئی۔ وہ اس کے پیچھے چل دیا۔

ساڑی کی دکان پر رما ساڑی دیکھنے میں مصروف ہو گئی۔ وہ خاموش بیٹھا، ادھر

اُدھر دیکھ رہا تھا۔ یک بارگی اس کی نگاہ خوبصورت عورت کے اس آدم قد بت پر ٹک گئی جو شیشے کے کیبن میں کھڑی کردی گئی تھی۔

رما اور خوبصورت بت......! خوبصورت بت اور رما!

وہ کبھی رما کو دیکھتا، کبھی اس بت کو۔

وہ دونوں میں فرق نہیں کر پا رہا تھا۔

بے جان جسم

دونوں بچوں کی نگاہیں سڑک کی طرف لگی تھیں۔ ماں! کل کی طرح آج بھی باپو خالی تھیلی لے کر آ گئے تو؟............ بار بار یہ سوال سن کر ماں نے چڑھ کر انھیں گھر سے باہر بھیج دیا۔

............کل کا دن تو جیسے تیسے گزر گیا، لیکن آج ایک ایک لمحہ گزارنا بھاری پڑ رہا ہے۔کل سے بچوں کے منھ میں اناج کا ایک دانا بھی نہیں گیا۔خدا،عزت رکھنا! سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا کہ اچانک کارخانہ بند ہو گیا اور دو ماہ میں گھر کی سب جمع پونجی ختم ہو گئی۔دو دن سے وہ صبح مزدوری کے لئے نکلتے اور شام کو خالی تھیلی لئے لوٹ آتے۔چولھے پر پانی کی پتیلی چڑھاتے ہوئے وہ سوچ میں ڈوبی تھی۔

بچے پھر اندر آ گئے۔لڑکی نے ماں کے پاس جا کر کہا ''ماں! تم کہو تو پڑوس سے روٹی مانگ لاؤں۔دانش کو چکر آ رہے ہیں۔''

''تھوڑے چاول میں نے بچا رکھے تھے۔وہ میں تمھارے لئے پکا رہی ہوں، تمھارے باپو آتے ہی ہوں گے۔'' اپنی بات پوری کر وہ اس جھوٹ کے لئے خدا سے معافی مانگنے لگی۔

دروازے پر آہٹ ہوئی۔

ماں کی خوشی نگاہوں سے پھوٹ پڑی۔ بیٹا باپ کی تھیلی کو چھو کر دیکھنے لگا۔اور بیٹی اس سے لپٹ گئی۔سبھی کے بے جان جسم کی حرکت تیز ہو گئی۔

ٹی.وی

’’سنا آپ نے ! بہو کو اپنے کمرے کے لئے ٹی وی چاہئے......‘‘

بیوی کے منھ سے جب انھوں نے یہ جملے سنے تو وہ فکر مند ہو گئے۔

......تین ماہ ہوئے بیٹے کی شادی ہوئے اور بہو نے ابھی سے ہی اپنی مانگ شروع کر دی۔ اوپر سے کتنی سیدھی دکھائی دیتی ہے، مگر اندر سے بہت چالاک ہے۔ سبھی ایک ساتھ بیٹھ کر ٹی.وی دیکھتے ہیں۔ کتنا اچھا لگتا ہے اور اسے اپنا الگ ٹی.وی. چاہئے......!

کل کچھ اور مانگے گی۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ سبھی کے ساتھ ٹی.وی بھی نہیں دیکھ رہی۔ یہ اس کا نسوانی کردار ہے۔ خسر دن بھر بہو کو کوستے رہے۔

رات کو انھوں نے بیٹے کو کمرے میں بلایا اور بولے ’’بیٹا ! ہمارا مشترکہ کنبہ ہے، اس لئے ہمیں کوئی بھی ایسا کام نہیں کرنا ہے جس سے گھر کا اتحاد و انتظام منتشر ہو۔

’’بابو جی ! میں سمجھا نہیں !‘‘

’’بیٹا ! بہو سے کہنا کہ وہ سبھی کے ساتھ بیٹھ کر ٹی.وی. دیکھا کرے۔‘‘

اب بیٹے کے سامنے صورت حال واضح ہو گئی۔

’’بابو جی ! بات یہ ہے کہ فلموں اور سیریلز میں کئی ایسے منظر آتے ہیں جنھیں آپ اور امی جی کے ساتھ دیکھنے میں اسے شرم محسوس ہوتی ہے......اس لئے اس نے ایسا کہا۔ آپ بے فکر رہئے، میں اسے کہہ دوں گا کہ یا تو وہ سبھی کے ساتھ ٹی.وی. دیکھے یا پھر ٹی.وی. دیکھنا چھوڑ دے۔‘‘ بیٹے کی بات سن کر ابو ہوش باختہ ہو گئے۔

صبح ہوتے ہی باپ نے ٹی.وی. خرید نے کی اجازت دے دی۔

خطاوار

شہر کے باہر ایک ’فارم ہاؤس‘ میں پارٹی چل رہی تھی۔

ایک شخص، جو شاندار سوٹ زیب تن کیے ہوئے تھا، پیالے کو ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا ”یار نیتا جی! کل آفس میں پرچم کشائی کرتے ہوئے جو تقریر کی تھی وہ بہت حالاتِ حاضرہ کی عکاس تھی اور اثر دار بھی......! آپ بُرا مت مانئے گا۔ ملک کی جس بدحالی کا ذکر آپ نے کیا اس کے لئے سب سے زیادہ ذمے دار آپ ہی ہیں۔ آپ لوگوں کو نہ شرح تنخواہ میں اضافے کے رکنے کا خوف ہے اور نہ ہی برخواستگی کا۔ آپ لوگ جو چاہیں بے خوف کر سکتے ہیں۔ یہ سارے حصار تو ہمارے جیسے افسران کے لئے ہوتے ہیں۔“

اپنا کلف دار کرتا ٹھیک کرتے ہوئے نیتا جی بولے ”سر! آپ شاید بھول رہے ہیں کہ جب ہم عوام کے ذریعے منتخب کئے جاتے ہیں تب ہم کوری سلیٹ کے مانند ہوتے ہیں......آپ لوگ اس میں غلط عبارت لکھنا سکھاتے ہیں۔“

تیسرا شخص، جو اب تک آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا، فلسفیانہ انداز میں بولا ”میرا خیال آپ دونوں سے الگ ہے، سب کو معلوم ہے کہ نامہ نگار سماج کے بیدار پہرے دار ہوتے ہیں۔ اگر یہ اپنے فرائض کو ایمان داری سے پورا کریں تو ملک کی یہ حالت نہیں ہوتی۔“

”ہم لوگوں کو کوئی خطا کار نہیں مانے گا۔ کیونکہ براہ راست عوام کو نہیں ٹھگتے۔ ہم تو

آپ جیسے لوگوں کو اپنا نشانہ بناتے ہیں۔'' اپنی داڑھی کھجلاتے ہوئے نامہ نگار بولا۔اس کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا۔

پارٹی کا مزہ کرکرا ہوتا دیکھ ایک سنیئر آفیسر نے سبھی کو خاموش کرتے ہوئے کہا ''نہ حکومت کے افسران خطا کار ہیں اور نہ نیتا اور نہ نامہ نگار، خطاوار عوام ہے۔عوام بے وقوف ہے۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ رشوت لینے والے سے بڑا خطاوار رشوت دینے والا ہوتا ہے۔ پھر بھی داڑھی میں ہاتھ ڈال کردے جاتی ہے۔''

''آپ سب درست فرما رہے ہیں مگر ایک بات اور ہے جو غور طلب ہے!''

کیا......؟'' مختلف آوازیں گونج اٹھیں۔

''جنتا کا بے وقوف ہونا ہم سب کی بھلائی میں ہے۔''

اس جملے نے پارٹی میں جان ڈال دی۔

کوئی تالی بجانے لگا، کوئی خوشی سے ٹیبل ٹھوکنے لگا، تو کوئی رقص کرنے لگا۔

جیب کترے

''کتنے روپئے تھے تمھاری جیب میں......؟''

''جی...... پندرہ ہزار!''

''اتنے روپئے تمھارے پاس کہاں سے آئے......!''

''جی......جی...... میں فیکٹری میں انجینئر ہوں۔ آج تنخواہ لے کر گھر جارہا تھا۔ تبھی یاد آیا کہ بچوں کے لئے جلیبیاں لیتا چلوں۔ جلیبی خرید کر دام دینے کے لئے جب جیب میں ہاتھ ڈالا تو پرس غائب تھا۔''

''کہاں کی بات ہے...... میرا مطلب ہے کہ کس جگہ تمھاری جیب کٹی؟''

''شکر بازار والی گلی میں......!''

''ٹھیک ہے، آپ رپورٹ لکھوادیجئے، پولس پوری کوشش کرے گی کہ جیب کترا پکڑا جائے۔''

انسپکٹر نے کانسٹبل کو رپورٹ لکھنے کا حکم دیا۔ وہ کانسٹبل کے پاس جاکر رپورٹ درج کرانے لگا۔

اس کے تھانے سے باہر نکلتے ہی انسپکٹر نے کانسٹبل سے پوچھا ''کیوں، شکر بازار والی گلی تو بدری کا علاقہ ہے!''

''جی صاحب......!'' کانسٹبل نے دھیرے سے کہا۔

''پندرہ دنوں کے لئے بدری گاؤں گیا تھا...... آج کے اس واقع سے ظاہر ہوگیا

ہے کہ وہ لوٹ آیا ہے۔ کانسٹبل! تم بدری کے پاس جاؤ......دس لے آنا اور پانچ اسی کے پاس رہنے دینا! سنو، اس کی جیب بھی تو کترنی ضروری ہے، نہیں تو ان لوگوں کے من سے پولس کا ڈر ہی ختم ہو جائے گا۔" انسپکٹر نے کانسٹبل کو حکم دیا۔

......صبح سے شام ہونے کو آئی لیکن کہیں سے بھی روپے نہیں ملے!

خدا دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے! ہتھیلی کو کھجلاتے ہوئے انسپکٹر خوش ہونے لگا۔

چُوک

پچھلی بار صاحب کو اپنے سالے کی شادی میں شریک ہونے قریب کے شہر میں جانا تھا۔ اس نقطے کو ذہن میں رکھ کر انھوں نے جب ملازمین کو وقت مقررہ پر حاضر ہونے کا نوٹس نکالا تو اس میں دانشتہ طور پر ''گذارش'' لفظ کا استعمال کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جملہ اسٹاف نے چھٹی کا لطف اٹھایا۔ پرچم کشائی کی ساری ذمے داری بڑے بابو کے ذمے سپرد کر کے صاحب شادی میں شریک ہونے چلے گئے۔

دوسرے دن صاحب نے اخبار میں اپنی آفس میں الٹا پرچم لہرا دیئے جانے کی خبر پڑھا تو ان کے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔

وہ واقعہ یاد آتے ہی ان کا موڈ خراب ہو گیا۔ انھوں نے گھنٹی بجائی اور بڑے بابو کو بلا کر بولے، ''بابو جی! آپ کوئی بھی کام ٹھیک سے نہیں کر پاتے۔ پچھلے پرچم کشائی پر آپ کی اس چوک کے سبب مجھے افسران کی کتنی باتیں سننی پڑیں، آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس دفعہ حاضر دماغ رہئے گا۔ سارا کام مکمل ہو جانے کے بعد ہی میں گھر جاؤں گا، ہاں! ایک نوٹس ٹائپ کروا کر لائیے۔ جس میں کل سبھی کو وقت مقررہ پر آنا ''لازمی'' ہے تحریر کیجئے گا۔''

بڑے بابو 'لیس سر' کہتے ہوئے دو قدم چلے، پھر کچھ سوچ کر بولے ''سر! سارا قصور چپراسی سکھ رام کا تھا۔ پرچم اوپر چڑھانے کی ذمے داری اسے دے کر میں مطمئن ہو گیا۔ آپ کے حکم کے مطابق میں وقت پر دفتر پہنچا۔ میں نے ڈوری کھینچی، پرچم کو سلام کیا اور گھر آ گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس کم عقل نے الٹا پرچم اوپر چڑھا دیا۔''

انھوں نے اس چوک کا سارا الزام سکھ رام پر عائد کر دیا۔

نام: حدیث انصاری

والد کا نام: شعبان انصاری

سن پیدائش: ۵؍مئی ۱۹۶۳ء

ابتدائی وثانوی تعلیم: ہائی اسکول، ڈیہواں، بلیا (یوپی)

فاضل: جامعہ اثریہ دارالحدیث، مئوناتھ بھنجن (یوپی)

بی.اے. ایم.اے. شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ (یوپی)

پی ایچ.ڈی: دیوی اہلیہ یونیورسٹی، اندور (ایم. پی)

ملازمت: اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، اسلامیہ کریمیہ کالج، اندور (دسمبر ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۸ء تک)

اسسٹنٹ پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو، اسلامیہ کریمیہ کالج، اندور (جنوری ۱۹۹۹ء سے فروری ۲۰۱۲ء تک)

ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو، موہن لال سکھاڑیا یونیورسٹی، اودے پور (راجستھان) (فروری ۲۰۱۲ء سے تاحال)

ترتیب وتالیف بہ اشتراک: درسی اُردو کتب برائے این سی ای آر ٹی نئی دہلی

درسی اُردو کتب برائے ایس سی ای آر ٹی، بھوپال، مدھیہ پردیش.

درسی اُردو کتب برائے مدھیہ پردیش مدرسہ بورڈ، بھوپال. سیکنڈری سطح پر اردو تدریس کی تربیت وحکمت عملی کا فروغ برائے آر آئی ای، بھوپال. پرائمری سطح پر اُردو تدریس کی تربیت، معاون اشیاوحکمتِ عملی کا فروغ برائے آر آئی ای، بھوپال

مطبوعہ کتب: فضا ابن فیضی: شخصیت اور فن

• تلاشِ فکر وفن • سرمایۂ فکر وادب

تصانیف زیر طبع: • ٹوٹی طناب (مختصر افسانے)

پس حرف وحرکت (ڈرامے)

موجودہ پتہ: L-1-4، اسٹاف کالونی، یونیورسٹی کیمپس، موہن لال سکھاڑیا یونیورسٹی، اودے پور (راجستھان)

رابطہ: 09414145197

نام: یوگیندر ناتھ شکل

سن پیدائش: ۴؍مارچ ۱۹۵۶ء

جائے ولادت: اندور

تعلیمی لیاقت: ایم.اے (گولڈ میڈلسٹ)، پی ایچ.ڈی (ہندی)

ادبی سرگرمیاں: تیس سال سے مسلسل ادبی ریاضت میں مصروف

• ملک کے مختلف ادبی رسالوں، ماہناموں میں تحقیقی مضامین، شاعری اور تقریباً ۵۰۰ مختصر افسانے چھپ چکے ہیں۔ بیشتر مختصر کہانیوں کا ترجمہ گجراتی، پنجابی، سندھی، انگریزی، سنسکرت کنڑ، مراٹھی، مالوی، نماڑی وغیرہ زبانوں میں ہو چکا ہے۔ لگھو کتھاؤں کا پٹارا (ہندی)، لگھو کتھانچا گلدستہ (مراٹھی) اور کتھانجلی (سنسکرت) شبھ یاترا (مراٹھی) میں شائع۔

ادارت: "روزنامہ بھاشکر"، مانس سنگم ادبی رسالہ، ریسرچ ۲۰۰۰ (تحقیقی رسالہ)، 'واگ دھارا' (لگھو کتھا، خصوصی شمارہ) اور لگھو کتھا انتخاب 'سمپربھ' کی ادارت

اعزاز: مختصر کہانی 'سلبھی سمان' • منچ سمان

پیشہ: پروفیسر، صدر شعبۂ ہندی، گورنمنٹ نربھئے سنگھ پٹیل سائنس کالج بھنورکنواں، اندور

مستقل پتہ: ۳۹۰- سداما نگر، انپورنا روڈ، اندور ۴۵۲۰۰۹ (مدھیہ پردیش)

رابطہ: 9977547030

ISBN 938331321-8

9789383313211

Al-Balagh Publications

New Delhi-25